فہرست

شذرات	روزے کا مقصد	جاوید احمد غامدی	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۱۱۸۔۱۲۹)	جاوید احمد غامدی	۷
معارف نبوی	مکہ شہر کی ابدی حرمت	معز امجد	۱۳
	جس نے ایک رکعت نماز پالی	ساجد حمید	۱۷
دین و دانش	اخلاقیات (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۲۱
نقطۂ نظر	''محدث'' کی کرم فرمائیاں	پروفیسر خورشید عالم	۳۷
	اسلام کا تصور عبادت (۲)	الطاف احمد اعظمی	۴۲
حالات و وقائع	عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ	محمد وسیم اختر مفتی	۵۳
اصلاح و دعوت	بدگمانی کیا ہے، اس سے کیسے بچیں؟	ساجد حمید	۵۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

روزے کا مقصد

[مصنف کی کتاب ''قانون عبادات'' کے مضمون ''روزہ'' سے انتخاب]

روزے کا مقصد قرآن مجید نے سورۂ بقرہ میں یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ اس کے لیے اصل میں 'لعلکم تتقون' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات سے ڈرتا رہے کہ اس نے اگر کبھی ان حدود کو توڑا تو اس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

پہلی یہ کہ روزہ اس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ فجر سے مغرب تک کھانے کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی روزے دار کے حلق سے نہیں گزرتا اور وہ ان چیزوں کے لیے نفس کے ہر مطالبے کو محض اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ روزے کا یہ عمل جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ حقیقت روزے دار کے نہاں خانۂ وجود میں اتر جاتی، بلکہ اس کی جبلت میں پیوست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پروردگار کا بندہ ہے اور اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی تسلیم و اعتراف کے ساتھ وہ اپنے مالک کی فرماں روائی کے سامنے سپر ڈال دے اور خیال و عمل، دونوں میں اپنی آزادی اور خود مختاری کے ادعا سے

دست بردار ہو جائے۔ اس سے، ظاہر ہے کہ خدا پر آدمی کا ایمان ہر لحاظ سے زندہ ایمان بن جاتا ہے، جس کے بعد وہ محض ایک خدا کو نہیں، بلکہ ایک ایسی سمیع و بصیر، علیم و حکیم اور قائم بالقسط ہستی کو مانتا ہے جو اس کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جس کی اطاعت سے وہ کسی حال میں انحراف نہیں کر سکتا۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

دوسری یہ کہ روزہ اس احساس کو بھی دل کے اعماق اور روح کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے کہ آدمی کو ایک دن اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ ماننے کو تو یہ بات ہر مسلمان مانتا ہے، لیکن روزے میں جب پیاس تنگ کرتی، بھوک ستاتی اور جنسی جذبات پوری قوت کے ساتھ اپنی تسکین کا تقاضا کرتے ہیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ تنہا یہی احساس جواب دہی ہے جو آدمی کو بطن و فرج کے ان مطالبات کو پورا کرنے سے روک دیتا ہے۔ رمضان کا پورا مہینا ہر روز گھنٹوں وہ نفس کے ان بنیادی تقاضوں پر محض اس لیے پہرا لگائے رکھتا ہے کہ اسے ایک دن اپنے مالک کو منہ دکھانا ہے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی کی حالت میں حلق پیاس سے چٹختا ہے، برفاب سامنے ہوتا ہے، وہ چاہے تو آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا؛ بھوک کے مارے جان نکل رہی ہوتی ہے، کھانا موجود ہوتا ہے، مگر نہیں کھاتا؛ میاں بیوی جوان ہیں، تنہائی میسر ہے، چاہیں تو اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں، مگر نہیں کرتے۔ یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کا احساس اس سے دل و دماغ میں پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، اگر غور کیجیے تو دوسری موثر ترین چیز یہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تیسری یہ کہ تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اس سے زیادہ آسان اور اس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل و انصاف، عفو و درگزر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔

روزے کا مقصد یہی تقویٰ ہے اور اس کے لیے اللہ نے رمضان کا مہینا مقرر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا ہے۔ روزے کے مقصد سے اس کا کیا تعلق ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''غور کرنے والے کو اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آ سکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے، اس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی، وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اس کی شکر گزاری کا خاص مہینا ٹھیرا دیا جائے تاکہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اس شکر گزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے، اور جس کے حاملین ہی کے لیے درحقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔... گویا اس حکمت قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے۔ اس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینا موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشوونما بخشتا ہے، وہ تقویٰ کی فصل ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۵۱)

یہ مقصد روزے سے لازماً حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھنے والے ان خرابیوں سے بچیں جو اگر روزے کو لاحق ہو جائیں تو اس کی تمام برکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ خرابیاں اگرچہ بہت سی ہیں، مگر ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ ہر روزے دار کو ان کے بارے میں ہوشیار رہنا چاہیے۔

ان میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ لوگ رمضان کو لذتوں اور چٹخاروں کا مہینا بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس مہینے میں جو خرچ بھی کیا جائے، اس کا اللہ کے ہاں کوئی حساب نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح کے لوگ اگر کچھ کھاتے پیتے بھی ہوں تو ان کے لیے یہ پھر مزے اڑانے اور بہار لوٹنے کا مہینا ہے۔ وہ اس کو نفس کی تربیت کے بجائے اس کی پرورش کا مہینا بنا لیتے ہیں اور ہر روز افطار کی تیاریوں ہی میں صبح کو شام کرتے ہیں۔ وہ جتنا وقت روزے سے ہوتے ہیں، یہی سوچتے ہیں کہ سارے دن کی بھوک پیاس سے جو خلا ان کے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اسے وہ اب کن کن نعمتوں سے بھریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو روزے سے وہ کچھ پاتے ہی نہیں، اور اگر کچھ پاتے ہیں تو اسے وہیں کھو دیتے ہیں۔

اس خرابی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کام کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن اس کو جینے کا مقصد نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی اہتمام کے مل جائے، اس کو اللہ کا شکر کرتے ہوئے کھا لے۔ گھر والے جو کچھ دستر خوان پر رکھ دیں، وہ اگر دل کو نہ بھی بھائے تو اس پر خفا نہ ہو۔ اللہ نے اگر مال و دولت سے نوازا ہے تو اپنے

نفس کو پالنے کے بجائے اسے غریبوں اور فقیروں کی مدد اور ان کے کھانے پلانے پر خرچ کرے۔ یہ چیز یقیناً اس کے روزے کی برکتوں کو بڑھائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ انفاق کے معاملے میں یہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو گویا سراپا جود وکرم بن جاتے تھے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجائے، اسے بھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں، اور بعض حالتوں میں اپنے زیردستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اس کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ آدمی اس طرح کے موقعوں پر روزے کو اشتعال کا بہانہ بنانے کے بجائے اس کے مقابلے میں ایک ڈھال کی طرح استعمال کرے، اور جہاں اشتعال کا کوئی موقع پیدا ہو، فوراً یاد کرے کہ میں روزے سے ہوں۔ آپ کا ارشاد ہے: روزے ڈھال ہیں، لہٰذا تم میں سے جس شخص کا روزہ ہو، وہ نہ بے حیائی کی باتیں کرے، اور نہ جہالت دکھائے۔ پھر اگر کوئی گالی دے یا لڑنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں، میرے بھائی میں روزے سے ہوں۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ روزہ رکھنے والا اگر غصے اور اشتعال کے ہر موقع پر یاد دہانی کا یہ طریقہ اختیار کرے گا تو آہستہ آہستہ دیکھے گا کہ اس نے اپنے نفس کے شیطان پر اتنا قابو پا لیا ہے کہ وہ اب اسے گرا لینے میں کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں فتح کا یہ احساس اس کے دل میں اطمینان اور برتری کا احساس پیدا کرے گا اور روزے کی یہی یاد دہانی اس کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے گی۔ پھر وہ وہیں غصہ کرے گا، جہاں اس کا موقع ہو گا۔ وقت بے وقت اسے مشتعل کر دینا کسی کے لیے ممکن نہ رہے گا۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ بہت سے لوگ جب روزے میں کھانے پینے اور اس طرح کی دوسری دل چسپیوں کو چھوڑتے ہیں تو اپنی اس محرومی کا مداوا ان دل چسپیوں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن سے ان کے خیال میں روزے کو کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہل جاتا ہے۔ وہ روزہ رکھ کر تاش کھیلیں گے، ناول اور افسانے پڑھیں گے، نغمے اور غزلیں سنیں گے، فلمیں دیکھیں گے، دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکیں گے اور اگر یہ سب نہ کریں گے تو کسی کی غیبت اور ہجو ہی میں لپٹ جائیں گے۔ روزے میں پیٹ خالی ہو تو آدمی کو اپنے بھائیوں کا گوشت کھانے میں ویسے بھی بڑی لذت ملتی

ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات صبح اس مشغلے میں پڑتے ہیں اور پھر موذن کی اذان کے ساتھ ہی اس سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔

اس خرابی کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کا ادب سمجھے اور کوشش کرے کہ کم سے کم اناپ شناپ کہنے اور جھوٹی سچی اڑانے کے معاملے میں تو اس کی زبان پر تالا لگا رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی کچھ ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

اس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ جو وقت ضروری کاموں سے بچے، اس میں آدمی قرآن وحدیث کا مطالعہ کرے اور دین کو سمجھے۔ وہ روزے کی اس فرصت کو غنیمت جان کر اس میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعاؤں کا کچھ حصہ یاد کر لے۔اس طرح وہ روزے میں ان مشغلوں سے بچے گا اور بعد میں یہی ذخیرہ اللہ کی یاد کو اس کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اس کے کام آئے گا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات روزہ اللہ کے لیے نہیں، بلکہ اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کی ملامت سے بچنے کے لیے رکھتا ہے اور کبھی لوگوں میں اپنی دین داری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے یہ مشقت جھیلتا ہے۔ یہ چیز بھی روزے کو روزہ نہیں رہنے دیتی۔

اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی روزے کی اہمیت ہمیشہ اپنے نفس کے سامنے واضح کرتا رہے اور اسے تلقین کرے کہ جب کھانا پینا اور دوسری لذتیں چھوڑ ہی رہے ہو تو پھر اللہ کے لیے کیوں نہیں چھوڑتے۔اس کے ساتھ رمضان کے علاوہ کبھی کبھی نفلی روزے بھی رکھے اور انھیں زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرے۔اس سے امید ہے کہ اس کے یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِکُمْ، لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا، وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ، قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ، وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُھُمْ اَکْبَرُ، قَدْ بَیَّنَّا لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ ھٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَھُمْ، وَلَا یُحِبُّوْنَکُمْ، وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْکِتٰبِ کُلِّهٖ، وَاِذَا لَقُوْکُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا، وَاِذَا خَلَوْا

ایمان[۱۸۹] والو، (یہ تمھارے دوست نہیں ہیں، اِس لیے) اپنے سے باہر کے لوگوں کو بھیدی نہ بناؤ[۱۹۰]۔ تمھیں نقصان پہنچانے میں یہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ یہ تمھارے لیے زحمتوں کے خواہاں ہیں۔ اِن کی دشمنی اِن کے منہ سے نکلی پڑتی ہے اور جو کچھ اِن کے سینوں میں چھپا ہوا ہے، وہ اِس سے بھی سخت تر ہے۔ ہم نے یہ نشانیاں تمھارے لیے واضح کر دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ یہ تمھی ہو کہ اِن کو دوست

[۱۸۹] یہ اب ان مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے جو یا تو اپنی سادگی کی وجہ سے اہل کتاب کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے نہیں تھے یا ان سے جو تعلقات و روابط پہلے سے چلے آ رہے تھے، انھیں اپنی کمزوری کے باعث توڑنا نہیں چاہتے تھے۔

[۱۹۰] اصل میں لفظ 'بطانة' استعمال ہوا ہے۔ اس سے آدمی کے خواص و احباب اور محرمان راز مراد ہوتے ہیں۔

عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ، قُلۡ: مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ، اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ، وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا، وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡئًا، اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ ﴿۱۲۰﴾

وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ، وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۲۱﴾

رکھنا چاہتے ہو، مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے، دراں حالیکہ تم اللہ کی تمام کتابوں کو مانتے ہو۔[۱۹۱] اور (اِن کا طریقہ یہ ہے کہ) جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں[۱۹۲] اور جب الگ ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں ـــــ کہہ دو کہ اپنے اِسی غصے میں مر جاؤ۔ (اللہ تمھاری ہر چیز سے واقف ہے اور) اللہ تو سینوں کے راز تک جانتا ہے ـــــ تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو اِنھیں تکلیف پہنچتی ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اِس سے خوش ہوتے ہیں۔ (یہ تمھارے دوست نہیں ہیں، اِن کی پروا نہ کرو) اور (یاد رکھو کہ) اگر تم صبر کرو گے اور اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اِن کی کوئی تدبیر تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے گی، اِس لیے کہ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۱۸-۱۲۰

(یہ حقیقت اِنھیں سمجھاؤ، اے پیغمبر) اور (اِس کے لیے وہ موقع یاد دلاؤ) جب (احد کے دن) تم مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں[۱۹۳] پر کھڑا کرنے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تھے۔ (اُس وقت اللہ تمھارے ارادوں سے واقف تھا اور تمھاری باتیں سن رہا تھا) اور اللہ سمیع و علیم ہے۔ ۱۲۱

---

[۱۹۱] مطلب یہ ہے کہ تم ان کی کتاب کو مانتے اور ان کے دین کو اپنا دین سمجھتے ہو۔ بظاہر دشمنی کے لیے کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لیکن اس کے باوجود وہ تم سے دشمنی رکھتے ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ تم ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو؟

[۱۹۲] یہ بات وہ اس مفہوم میں کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کے لیے تو بے شک، خدا کے پیغمبر ہیں اور اس حیثیت سے وہ آپ کو مانتے ہیں، لیکن ان کے لیے آپ کی پیروی ضروری نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے ان کے اپنے پیغمبر ہی کافی ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلاَ، وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا، وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اُس وقت، جب تم میں سے دو گروہوں[۱۹۴] نے حوصلہ چھوڑ نا چاہا، دراں حالیکہ اللہ اُن کی مدد کے لیے موجود تھا اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ اللہ نے (اِس سے پہلے) بدر میں بھی تمھاری مدد کی تھی۔ جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔ (پھر بھی ناشکری کرتے ہو)؟ سو اللہ سے ڈرو تا کہ تم اُس کے شکر گزار رہو۔۱۲۲۔۱۲۳

---

[۱۹۳] اصل میں لفظ 'مقاعد' آیا ہے۔ یہ 'مقعد' کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں، لیکن قرینہ موجود ہو تو اس سے جنگ کا مورچا بھی مراد ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

[۱۹۴] ان دو گروہوں سے اشارہ، مورخین کے بیان کے مطابق قبیلۂ خزرج کے بنوسلمہ اور قبیلۂ اوس کے بنوحارثہ کی طرف ہے۔ یہاں جس واقعے کا ذکر ہوا ہے، اس کا پس منظر استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

"... ان دونوں گروہوں کے اندر منافقین کی شرارت کی وجہ سے کچھ بزدلی پیدا ہوئی، لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ منافقین درحقیقت اس جنگ کے لیے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس کمزوری کا اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے یہ چاہا کہ نکلنے سے پہلے صحیح صورت حال سامنے آجائے۔ اس کے لیے امتحاناً آپ نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ قریش کا مقابلہ مدینہ کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر؟ اس کا جواب سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ باہر نکل کر۔ چنانچہ انھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ یہی جواب دیا۔ لیکن منافقین نے مدینہ میں محصور ہو کر مقابلے کی مصلحتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آں حضرت نے جب صورت حال کا اندازہ کر لیا، منافقین کی کمزوری آپ پر واضح ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے دل میں تھا اور جس کا اظہار آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے کیا تھا۔ منافقین نے جب دیکھا کہ ان کی یہ سازش ناکام ہو گئی تو وہ نکلنے کو تو مسلمانوں کے ساتھ نکلے، لیکن نکلنے کے بعد ان کے لیڈر ابن ابی نے ان کو ورغلایا اور اس چیز کو بہانہ بنا کر کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، راستے میں تین سو آدمیوں کے لشکر کے ساتھ الگ ہو گیا۔ اس واقعہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کی بعض جماعتوں کے حوصلے پر اثر پڑا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار کفار کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ
الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى، اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا،
يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ، وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ، وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا، اَوْ يَكْبِتَهُمْ
فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ، اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ، اَوْ

یاد کرو، جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے جو (اِسی مقصد سے) اتارے گئے ہوں[195]؟ ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور تمھارے دشمن اِسی وقت تم پر آپڑیں تو تمھارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے[196]۔ ۱۲۴۔۱۲۵

اور یہ تو اللہ نے صرف اِس لیے کیا کہ تمھیں بشارت ہو اور تمھارے دل اِس سے مطمئن ہو جائیں اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے جو زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[197]۔ (اِس لیے کیا) تاکہ اِن منکروں کا ایک حصہ کاٹ دے یا اُنھیں ایسا ذلیل کرے کہ خوار ہو کر لوٹیں ـــــ تمھیں اِس معاملے میں

مقابلے میں کل ایک ہزار تھی۔ ایک ہزار آدمیوں میں سے تین سو آدمیوں کا عین موقع پر فرار، ظاہر ہے کہ ایک اہم حادثہ تھا جس سے کمزور طبائع کا اثر لینا قدرتی امر تھا۔‘‘ (تدبر قرآن ۲/۱۷۰)

[۱۹۵] روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمائی، جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہوا اور مسلمانوں کے بعض گروہوں میں اس سے کچھ بد دلی پیدا ہوئی۔

[۱۹۶] یعنی اس جنگ میں وہ اپنے امتیازی نشان لگا کر آئیں گے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خاص اہتمام کے ساتھ اس مہم کے لیے بھیجے گا۔

[۱۹۷] مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی کسی بشارت کے بغیر بھی ایمان والوں کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے کہ فتح و

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

يُعَذِّبَهُمْ، فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ، يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۲۹﴾

کوئی اختیار نہیں[۱۹۸] (کہ اللہ اِن کے ساتھ یہی کرے) یا اِن کی توبہ قبول کر لے، (اگر یہ توبہ کریں) یا اِن پر اپنا عذاب نازل کر دے، اِس لیے کہ یہ ظالم ہیں۔ (یہ اللہ ہی کا اختیار ہے) اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، وہ اللہ ہی کا ہے۔ وہ (اپنے قانون کے مطابق) جس کو چاہے گا، بخش دے گا اور جس کو چاہے گا، سزا دے گا۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۲۶۔۱۲۹

نصرت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔

[۱۹۸] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اپنی قوم کے مستقبل سے متعلق کوئی خیال یہاں گزرا ہے جس پر اس جملۂ معترضہ کے ذریعے سے بات کو روک کر توجہ دلائی گئی ہے کہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت اور جزا و سزا کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو تمھاری قوم کو توبہ کی توفیق دے گا اور چاہے گا تو ان پر بھی وہی عذاب نازل کر دے گا جو ان سے پہلے کی قوموں پر نازل ہوا ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کو کرنا ہے اور جو کچھ بھی وہ کرے گا، اپنی حکمت کے لحاظ سے اور اپنے قانون کے مطابق کرے گا۔ کسی دوسرے کے لیے اس میں دخل اندازی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ تاہم وہ غفور و رحیم ہے، اس لیے امید رکھنی چاہیے کہ وہ ان پر کرم فرمائے گا۔ جملۂ معترضہ کے بعد یہ پوری بات قرآن نے 'او يكبتهم فينقلبوا خائبين' پر اسی لیے عطف کر دی ہے کہ اس کے قارئین اس نظم کلام پر متنبہ رہیں۔

[باقی]

معز امجد

مکہ شہر کی ابدی حرمت

روى[1] أنـه قـال رسـول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يوم فتح مكة : لا تغزى هـذه بعد اليوم إلى يوم القيامة[2]، ولا يـقتل قرشى صبرا[3] بعد هذا اليوم[4] إلى يوم القيامة[5][6].

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: آج کے بعد اب قیامت تک کے لیے اس شہر پر حملہ نہیں کیا جانا چاہیے[1]، اور اس دن کے بعد قیامت تک کے لیے قریش[2] میں سے کوئی اپنے دفاع کا حق دیے بغیر[3] نہیں مارا جانا چاہیے۔

ترجمے کے حواشی

ا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے حکم خداوندی کے تحت مکہ کو شہر امن کے طور پر عزت دی جاتی تھی۔ مکہ پر حملہ آور ہونا یا حدود حرم میں کسی شخص کو قتل کرنا مکہ خصوصاً حرم سے متعلق حکم الٰہی کی خلاف ورزی سمجھا جاتا تھا۔ مکہ کی یہ حرمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عارضی طور پر اس وقت ختم کی گئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی طرف سے اتمام حجت کے بعد مشرکین بنی اسماعیل کے لیے موت کی سزا کا اعلان کیا گیا۔ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اسی بات کی یاددہانی کرائی ہے کہ شہر مکہ کی یہ حرمت میرے لیے محض ایک دن کے لیے اٹھائی گئی ہے، چنانچہ آج کے بعد جو کوئی بھی اس شہر پر حملہ آور ہوگا، وہ خدا کی قائم کردہ ایک ابدی حرمت کو توڑنے والا ہوگا۔

۲۔ مشرکین بنی اسماعیل کے اصل نمائندے چونکہ قریش ہی تھے، لہٰذا ان کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا۔

۳۔ کسی آدمی کو باندھ کر سب سے الگ تھلگ اس طرح چھوڑ دینا کہ وہ بھوک پیاس کے ہاتھوں ہلاک ہو جائے قتل صبر کہلاتا تھا۔ اس اصطلاح کا استعمال ان لوگوں کے لیے بھی کیا جاتا تھا جنھیں قابو کرنے کے بعد اس طرح باندھ کر مار دیا جاتا کہ وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر منکرین رسول کے لیے خدا کی طرف سے عذاب کے طور پر بعض کفار کو اپنے دفاع کا موقع دیے بغیر اسی طرح گھیراؤ کر کے قتل کیا گیا۔ رسول کے منکرین کو اس طرح دفاع کا حق دیے بغیر مار دینا چونکہ ایک خدائی فیصلہ تھا، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں متنبہ کیا ہے کہ آج کے بعد کسی شخص کو اپنے دفاع کا موقع دیے بغیر نہیں مارا جانا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متن کے حواشی

۱۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ روایت درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

مسلم، رقم ۱۷۸۲۔ ترمذی، رقم ۱۶۱۱۔ ابن حبان، رقم ۳۷۱۸۔ دارمی، رقم ۲۳۸۶۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۳، ۱۵۴۴۴، ۱۵۴۴۵، ۱۵۴۴۶، ۱۷۸۹۹، ۱۷۹۰۰، ۱۷۹۰۱، ۱۷۹۰۲، ۱۹۰۴۱، ۱۹۰۴۲۔ بیہقی، رقم ۱۸۵۲۶۔ حمیدی، رقم ۵۶۸، ۵۷۲۔ عبدالرزاق، رقم ۹۳۹۹۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۲۵۸۹۹، ۳۲۳۹۸، ۳۶۹۱۱، ۳۶۹۱۲۔

۲۔ 'لا تغزی هذه بعد اليوم إلى يوم القيامة' (اس شہر پر اب قیامت تک کے لیے حملہ نہیں کیا جانا چاہیے) کے الفاظ ترمذی، رقم ۱۶۱۱ میں روایت ہوئے ہیں، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۱۹۰۴۱ میں ان کے بجائے 'لا تغزى مكة بعدها أبدا' (اب کے بعد مکہ پر کبھی حملہ نہیں ہونا چاہیے) کے الفاظ، بیہقی، رقم ۱۸۵۲۶ میں 'لا تغزى بعدها إلى يوم القيامة' (اب کے بعد اس پر قیامت تک کے لیے حملہ نہیں ہونا چاہیے) کے الفاظ، احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۵ میں 'لا تغزى مكة بعد هذا العام أبدا' (اس سال کے بعد مکہ پر کبھی حملہ نہیں ہونا

چاہیے) کے الفاظ، احمد بن حنبل، رقم ۱۹۰۴۲ میں 'لا تغزى هذه بعدها أبدا إلى يوم القيامة' (اب کے بعد اس پر کبھی بھی قیامت تک کے لیے حملہ نہیں ہونا چاہیے) کے الفاظ، حمیدی، رقم ۵۷۲ میں 'لا تغزى مكة بعد هذا اليوم أبدا' (اس دن کے بعد مکہ پر کبھی بھی حملہ نہیں ہونا چاہیے) کے الفاظ اور ابن ابی شیبہ، رقم ۳۶۹۱۱ میں 'لا تغزى بعد اليوم إلى يوم القيامة' (آج کے بعد اس پر قیامت تک کے لیے حملہ نہیں ہونا چاہیے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۳۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۳ میں 'لا يقتل قرشي صبرا' (قریش میں سے کسی کا بھی قتل صبر نہیں ہونا چاہیے) کے بجائے 'لا ينبغي أن يقتل قرشي صبرا' (یہ جائز نہیں ہے کہ قریش میں سے کسی کا قتل صبر ہو) کے الفاظ، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۵ میں 'لا يقتل رجل من قريش صبرا' (قریش میں سے کوئی آدمی بھی قتل صبر کے ذریعے سے نہیں مارا جانا چاہیے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۴۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۳ میں 'بعد هذا اليوم' (اس دن کے بعد) کے بجائے ان کے مترادف الفاظ 'بعد يومه هذا' (اس دن کے بعد) روایت ہوئے ہیں، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۴ میں 'بعد اليوم' (آج کے بعد) کے الفاظ اور احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۵ میں 'بعد العام' (اس سال کے بعد) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۵۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۳ میں 'إلى يوم القيامة' (قیامت تک کے لیے) کے الفاظ روایت نہیں ہوئے، جبکہ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۵ میں ان الفاظ کے بجائے 'أبدا' (ہمیشہ) کا لفظ روایت ہوا ہے۔

۶۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۱۷۸۲ میں 'ولم يكن أسلم أحد من عصاة قريش غير مطيع. كان اسمه العاصى فسماه رسول الله صلى الله عليه وسلم مطيعا' (مطیع کے سوا منکرین قریش میں سے کوئی بھی اسلام نہ لایا۔ اس کا اصل نام العاصی (یعنی نافرمان) تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مسلمان ہونے کے بعد مطیع (یعنی فرماں بردار) کا نام دیا) کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں، جبکہ بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۳۷۱۸ میں 'ولم يكن أسلم أحد من عصاة قريش غير مطيع' (مطیع کے سوا منکرین قریش میں سے کوئی بھی اسلام نہ لایا) کے بجائے 'ولم يدرك المسلمون أحدا من كفار قريش غير مطيع' (مسلمانوں نے کفار قریش میں سے مطیع کے سوا کسی کو نہ پایا) کے الفاظ، جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۱۷۹۰۰ میں 'ولم يدرك

الإسلام أحد من عصاة قريش غير مطيع' (منکرین قریش میں سے مطیع کے سوا کسی نے بھی اسلام قبول نہ کیا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ ابن حبان، رقم ۳۷۱۸ میں اسلام لانے والے آدمی کا نام 'العاصی' کے بجائے 'العاص' جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۱۵۴۴۶ میں 'عاصی' نقل ہوا ہے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شرح موطا

ساجد حمید

جس نے ایک رکعت نماز پالی

[۱۶] وحدثنی عن مالك عن نافع: ان عبد اللّٰه بن عمر بن الخطاب کان یقول:

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے:

اِذَا فَاتَتْكَ الرَّكْعَةُ فَقَدْ فَاتَتْكَ السَّجْدَةُ.

''جس نے رکوع کھو دیا، اس نے سجدہ بھی کھو دیا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[۱۷] وحدثنی عن مالك انه بلغه ان عبد اللّٰه بن عمر وزید بن ثابت کانا یقولان:

عبد اللہ بن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے:

مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ.

''جس نے رکوع پایا، اسی نے سجدہ پایا۔''

[۱۸] وحدثنی یحیی عن مالك انه بلغه ان ابا هريرة كان يقول:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے:

مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ وَمَنْ فَاتَهُ قِرَائَةُ اُمِّ الْقُرْآنِ فَقَدْ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ.

''جس نے رکوع پایا، اسی نے سجدہ پایا، اور جس نے فاتحہ کی قرأت کھودی، وہ بڑے خیر سے محروم رہا۔''

شرح

مفہوم و مدعا

یہ تینوں آثار بالاتفاق یہ بیان کر رہے ہیں کہ نماز پانے کے معاملے میں، خواہ وہ جماعت میں پانا ہو یا آخری وقت سے پہلے پانا ہو، صرف سجدہ پانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سجدہ پانے کا اسی کو فائدہ ہے جس نے رکوع پالیا۔ یعنی رکوع پانے کے بعد ہی نماز ملنے یا ملنے کے لیے سجدہ کی اہمیت ہے۔

ابوہریرہ کے قول سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نماز پانے کے لیے فاتحہ کا نہ پڑھنا ان کے نزدیک ضروری نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کو کھونے والا خیر کثیر سے محروم رہا۔

جیسے ہم پچھلی روایتوں میں وضاحت کر آئے ہیں کہ ان آثار کا تعلق دراصل امام کے پیچھے رکعت پانے سے ہے۔ یعنی امام کے پیچھے اسی کو رکعت ملے گی جس نے رکوع پالیا۔ جس نے سجدہ پایا اور رکوع میں وہ نہیں مل سکا تو اس نے جماعت میں شمولیت نہیں کی۔

لغوی مسائل

ان تینوں آثار میں جملوں کا لغوی ترجمہ یوں ہوگا: جس کو رکوع نے کھودیا اس کو سجدہ نے بھی کھودیا۔ لیکن ہم نے اردو میں اس کے مرادی معنی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس لیے کہ اردو اس اسلوب بیان کو قبول نہیں کرتی۔ اگرچہ اردو میں بھی مجازاً فاعل کی جگہ مفعول اور مفعول کی جگہ فاعل آجاتا ہے، مگر یہاں یہ اسلوب اختیار کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

درایت

قرآن وسنت سے تعلق

یہ اقوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کی روشنی میں کہے گئے ہیں۔ ان اقوال کا ذکر ہم پچھلی روایت میں کر آئے ہیں۔ یہاں ان کا دہرانا محض تکرار ہے۔ پچھلی روایت کی شرح پر نگاہ ڈال لیجیے۔

دیگر طرق

صرف ابن عمر کے قول کی ایک روایت سنن بیہقی میں ملی ہے۔ ابو ہریرہ کے قول کی دوسری روایتیں ہمیں نہیں مل سکیں۔

قال نافع و كان ابن عمر اذا وجد الامام قد صلى بعض الصلاة صلى مع الامام ما ادرك ان قام قام و ان قعد قعد حتى يقضى الامام صلاته لا يخالفه فى شىء قال و كان ابن عمر رضى اللّٰه عنه يقول اذا فاتتك الركعة فقد فاتتك السجدة. (بیہقی، رقم ۳۴۳۵)

''نافع کہتے ہیں کہ ابن عمر جب کبھی اس طرح نماز میں ملتے کہ امام نماز کا کچھ حصہ پڑھ چکا ہوتا تو آپ فوراً جماعت میں شامل ہو جاتے۔ اس طرح کہ جب امام کھڑا ہوتا تو وہ بھی کھڑے ہو جاتے اور جب وہ بیٹھتا تو وہ بھی بیٹھ جاتے، وہ ایسا ہی کرتے رہتے، یہاں تک کہ امام نماز ختم کر دیتا، وہ امام کی ذرا بھی خلاف ورزی نہ کرتے۔ پھر انھوں نے کہا کہ ابن عمر کہا کرتے تھے کہ جس نے رکوع کھو دیا، اس نے سجدہ بھی کھو دیا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس باب پر ایک نظر

اس باب میں امام مالک نے اس بات کو واضح کرنے کے لیے کہ نماز پانے کے معنی کیا ہیں؟ کیا نماز میں کسی بھی جگہ شامل ہونے سے نماز مل جائے گی یا اس کا کوئی حصہ ہے جسے پانے ہی سے نماز ملے گی، ایک خاص ترتیب سے احادیث لائے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت پانے کا ثواب اور وقت پر نماز پڑھنے کا ثواب اسی کو ملے گا جو کم از کم پوری ایک رکعت پائے گا۔ جماعت کے ساتھ پوری رکعت پانے سے مراد رکوع میں ملنا ہے اور عصر اور فجر میں سورج کے طلوع وغروب سے پہلے ایک رکعت پانے سے مراد یہ ہے کہ آدمی طلوع یا غروب سے پہلے پہلی رکعت کے سجدے کر لے تو پھر اس کی نماز وقت پر ادا ہوگی۔

جماعت میں اگر کوئی آدمی اس طرح شامل ہو کہ اسے آخری رکعت پوری نہ ملے۔ تو اس باب کی روایات کے مطابق اسے جماعت نہیں ملی۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کو صرف اکیلے نماز پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ نہیں، بلکہ اس کو اس کی سعی کا اجر ضرور ملے گا جو اس نے جماعت پانے کے لیے کی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

اخلاقیات

(۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جمال و کمال

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ، وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ، وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ، وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ، وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ، وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ، وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ، وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ، وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ، وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ، اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا. (الاحزاب۳۳: ۳۵)

”وہ مرد اور وہ عورتیں جو مسلمان ہیں، مومن ہیں، بندگی کرنے والے ہیں، سچے ہیں، صبر کرنے والے ہیں، اللہ کے آگے جھک کر رہنے والے ہیں، خیرات کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے ہیں، اُن کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔“

انسان کے اخلاقی وجود کا حسن جب خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں درجۂ کمال کو پہنچتا ہے تو اس سے جو

اوصاف پیدا ہوتے ہیں یا قرآن مجید کی رو سے ہونے چاہییں، وہ یہی ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ خدا کی مغفرت ان نفوس قدسیہ کی منتظر ہے اور اس نے ایک اجر عظیم ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تصوف میں تو انسان کی تمام جدوجہد کا منتہاے کمال یہی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی صفات کا مظہر بننے کی کوشش کرے: خدا علیم و خبیر ہے تو وہ بھی عالم الغیب والشہادہ بن کر جیے؛ خدا کی شان تجرد ہے تو وہ بھی اپنے اندر یہی شان پیدا کرے؛ خدا بے نیاز ہے تو وہ بھی بشری تقاضوں اور انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہو جائے؛ خدا انفس و آفاق میں تصرف کرتا ہے تو وہ بھی پانی پر چلے، آگ سے کھیلے، بیماروں کو ہاتھ لگائے اور شفایاب کر دے، مردوں کو جلائے اور ارواح و قلوب میں جو تصرف چاہے کرے۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ اس نے کمال کا جو سب سے بڑا درجہ بیان کیا ہے، وہ خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور اس کے نتیجے میں ان اوصاف کا حامل بن کر جینے کا ہے جو قرآن نے یہاں ایک ہی آیت میں جمع کر دیے ہیں۔ یہ دس چیزیں ہیں اور پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دین کا جمال و کمال قرآن کے نزدیک یہی ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے آگے اگر کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے اور اس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اخذ و اکتساب کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے، یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے۔

ہم یہاں ان اوصاف کی وضاحت کریں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسلام

پہلی چیز اسلام ہے۔ یہ جب اس طریقے سے ایمان کے ساتھ آتا ہے جس طرح یہاں آیا ہے تو اس سے دین کا ظاہر مراد ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہدایت جو انسان کے قول و فعل اور اعضا و جوارح سے متعلق ہے۔ چنانچہ آدمی کی زبان اگر اللہ و رسول کے حکم پر کھلنے اور بند ہو جانے کے لیے آمادہ ہے، اس کی آنکھیں اگر ان کے ایما سے دیکھنے اور جھک جانے کے لیے تیار ہیں، اس کے کان اگر ان کی ہدایت پر سننے اور سننے سے انکار کر دینے کے لیے مستعد ہیں، اس کے ہاتھ اگر ان کے ارشاد سے اٹھنے اور گر جانے کے منتظر ہیں اور اس کے پاؤں اگر ان کے فرمان پر چلنے اور رک جانے سے گریز نہیں کرتے تو یہی اسلام ہے۔ انبیا علیہم السلام کی زبان پر 'أَسۡلَمۡتُ وَجۡهِيَ لِلّٰهِ'[۲] اور 'أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ'[۳] کے الفاظ اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے آئے ہیں۔

۲؎ آل عمران ۳: ۲۰۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بہترین نمونہ بھی انبیا علیہم السلام ہی ہیں۔ لہٰذا ہدایت کی گئی ہے کہ تسلیم ورضا کے اس مرتبے تک پہنچنے کے لیے لوگ ان ہستیوں کی اتباع کریں جنھیں اللہ نے ان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (آل عمران ۳:۳۱)

''ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا، اور (یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ) اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔''

یہ اتباع جس شعور اور جس جذبے کے ساتھ ہونی چاہیے، اس کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس طرح فرمائی ہے:

''... رسول خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے اور اس کی ایک ایک ادا معرفت الٰہی کا نشان ہوتی ہے، اس وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں، وہ رسول کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ رسول کے اندر وہ علم دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عمل دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، وہ عادات دیکھتے ہیں جو خدا کو پسند ہیں، وہ صفات دیکھتے ہیں جو خدا کو محبوب ہیں، وہ جمال دیکھتے ہیں جس پر جمال خداوندی کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رسول کے ایک ایک نقش کو تلاش کر کر کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کی محبت میں کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا یہ صلہ پاتے ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں۔'' (تزکیۂ نفس ۱۱۷)

www.javedahmadghamidi.com

ایمان

دوسری چیز ایمان ہے۔ یہ دین کا باطن ہے اور یہاں اس سے مراد وہ یقین ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے وعدوں کے بارے میں اس کی حقیقی معرفت کے ساتھ پایا جائے۔ چنانچہ جو خدا کو اس طرح مانے کہ تسلیم ورضا کے بالکل آخری درجے میں اپنے دل و دماغ کو اس کے حوالے کر دے، قرآن کی اصطلاح میں وہ مومن ہے۔ دل کو طہارت، عقل کو روشنی اور ارادوں کو پاکیزگی اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی ایمان ہے جو علم و عمل، دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا اور انسان کے پورے وجود پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ کے ذکر اور اس کی آیتوں کی تلاوت اور انفس و آفاق میں ان

---

۳۷ البقرہ ۲:۱۳۱۔

آیتوں کے ظہور سے اس میں افزونی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ، وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ، زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا، وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. (الانفال ۸:۲)

''ایمان والے تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل لرز جائیں اور جب اُس کی آیتیں انھیں پڑھ کر سنائی جائیں تو اُن کا ایمان بڑھ جائے اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس شخص نے ایمان کی حلاوت پالی جو خدا کے رب، اسلام کے دین اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے پر راضی ہو گیا۔[۴] قرآن مجید نے اسے ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی ہے جس کی جڑیں زمین کے میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ، تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. (ابراہیم ۱۴:۲۴۔۲۵)

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ کی مثال کس طرح بیان فرمائی ہے؟ اس کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک شجرۂ طیبہ جس کی جڑیں زمین میں اتری ہوئی اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر موسم میں وہ اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دے رہا ہے۔ (یہ اس کی تمثیل ہے) اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس ارشاد خداوندی کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

''آیات میں کلمۂ طیبہ سے مراد، ظاہر ہے کہ کلمۂ ایمان ہے۔ اس کی تمثیل اللہ تعالیٰ نے ایسے ثمر بار درخت سے دی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری اتری ہوئی اور اس کی شاخیں فضا میں خوب پھیلی ہوئی ہوں اور وہ برابر ہر موسم میں اپنے رب کے فضل سے ثمر باری کر رہا ہو۔ زمین میں جڑوں کے گہرے اترنے سے مقصود فطرت انسانی کے اندر اس کا رسوخ و استحکام ہے کہ وہ گھورے پر اگے ہوئے پودے کی مانند نہیں ہے جس کی کوئی جڑ نہ ہو، حوادث کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی اس کو اکھاڑ پھینکے جیسا کہ کلمۂ کفر کی بابت فرمایا ہے کہ 'اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ'[۵] (جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے، اسے ذرا بھی ثبات حاصل نہ ہو)۔ بلکہ وہ ایک تناور

---

[۴] مسلم، رقم ۳۴۔

[۵] ابراہیم ۱۴:۲۶۔

درخت کے مانند اتنی پائدار اور گہری جڑیں رکھتا ہے کہ اگر اس پر سے طوفان بھی گزر جائیں جب بھی وہ ذرا متاثر نہ ہو۔ پھر اس کی فیض بخشی اور ثمر باری کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ ٹھونٹھ درخت کے مانند نہیں ہے جس سے نہ کسی کو سایہ حاصل ہو نہ پھل، بلکہ اس کی فضا میں پھیلی ہوئی سایہ دار شاخوں کے سایے میں قافلے آرام کرتے اور ہر موسم میں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ ان فیوض و برکات کی طرف ہے جو ایک صاحب ایمان کے ایمان سے خود اس کی زندگی اور اس کے توسط سے ان لوگوں کی زندگیوں پر مترتب ہوتے ہیں جو اس سے کسی نوعیت سے قرب کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ یہ فیوض و برکات لازماً علمی اور عملی، دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں جو اس کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں اور ان سے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف رفعت و سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔'' (تزکیۂ نفس ۳۲۵)

یہی ایمان ہے جس کا یہ تقاضا قرآن میں بیان ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اس کے حاملین کو اللہ و رسول سے زیادہ محبوب نہیں ہونی چاہیے۔ ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ: اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ، وَاَبْنَآؤُکُمْ، وَاِخْوَانُکُمْ، وَاَزْوَاجُکُمْ، وَعَشِیْرَتُکُمْ، وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْھَا، وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا، وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ، اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ، وَرَسُوْلِہٖ، وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ، وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ. (التوبہ ۹: ۲۴)

''ان سے کہہ دو کہ تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان اور تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا اور وہ تجارت جس کے مندے سے تم ڈرتے ہو اور تمھارے وہ گھر جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اگر اللہ سے، اس کے رسول سے، اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے، اور (جان لو کہ) اس طرح کے بدعہدوں کو اللہ راہ یاب نہیں کرتا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ حقیقت مختلف طریقوں سے واضح فرمائی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک حقیقی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک وہ مجھے اپنی اولاد، والدین اور اعزہ واقربا سے زیادہ محبوب نہ سمجھے[٦]۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا ہے کہ اللہ و رسول کے ساتھ یہی محبت ہے جس کے بعد کوئی شخص ایمان کی اصلی لذت سے آشنا ہو سکتا ہے[٧]۔

٦؎ بخاری، رقم ۱۵۔ مسلم، رقم ۴۴۔

٧؎ بخاری، رقم ۱۶۔

لیکن یہ کس قسم کی محبت ہے؟ اس کے بارے میں لوگ چونکہ بہت کچھ غلط فہمیوں اور افراط و تفریط میں مبتلا رہتے ہیں، اس لیے اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اس سے مقصود محض وہ جذباتی محبت نہیں ہے جو آدمی کو فطری طور پر اپنے بیوی بچوں سے یا اپنے دوسرے عزیزوں کے ساتھ ہوتی ہے، بلکہ اس سے مقصود وہ عقلی اور اصولی محبت بھی ہے جو ایک شخص کو کسی اصول اور مسلک کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی زندگی میں ہر جگہ اسی اصول اور اسی مسلک کو مقدم رکھتا ہے۔ اس اصول اور مسلک کے اوپر وہ ہر چیز اور ہر اصول، ہر مسلک اور ہر خواہش اور ہر حکم کو قربان کر دیتا ہے، لیکن خود اس کو دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہیں کرتا۔ اس اصول اور مسلک کی برتری کے لیے وہ ساری چیزوں کو پست کر دیتا ہے، لیکن اس اصول اور مسلک کو کسی حالت میں بھی پست دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس سے خود اس کا اپنا نفس اس مسلک کی مخالفت میں مزاحم ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی لڑتا ہے، اگر دوسرے اس سے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بیوی بچوں اور اعزہ و اقارب کے مطالبات بھی اگر اس کے اس مسلک کے مطالبات سے کسی مرحلہ پر ٹکراتے ہیں تو وہ اپنے اس اصول اور مسلک کا ساتھ دیتا ہے اور بے تکلف اپنے بیوی بچوں کی خواہشوں اور اپنے خاندان اور قوم کے مطالبہ کو ٹھکرا دیتا ہے۔'' (تزکیۂ نفس ۱۱۹)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایمان و اسلام کی یہی حقیقت ہے جو پیغمبر کی زبان فیض ترجمان پر یہ بے مثل دعا بن گئی ہے:

اللھم، اسلمت وجھی الیک، وفوضت امری الیک، والجأت ظھری الیک، رغبۃ ورھبۃ الیک، لا ملجا ولا منجا منک الا الیک، اللّٰھم، امنت بکتابک الذی انزلت وبنبیک الذی ارسلت. (بخاری، رقم ۲۴۴)

''اے اللہ، میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا ہے، اور اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا ہے اور تجھ سے ٹیک لگا لی ہے، تیری عظمت سے لرزتے ہوئے اور تیرے اشتیاق میں بڑھتے ہوئے۔ تجھ سے بھاگ کر کہیں پناہ اور کہیں ٹھکانا نہیں، اور اگر ہے تو تیرے ہی پاس ہے۔ پروردگار، میں تیری کتاب پر ایمان لایا ہوں جو تو نے نازل کی ہے اور تیرے نبی پر ایمان لایا ہوں جسے تو نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔''

قنوت

تیسری چیز قنوت ہے۔ یہ وہ قلبی کیفیت ہے جو انسان کو پورے اخلاص اور یک سوئی کے ساتھ دائماً اپنے پروردگار

کی اطاعت پر قائم رکھتی ہے۔ بندۂ مومن کے نہاں خانۂ وجود میں عبد و معبود کے تعلق کا سب سے نمایاں ظہور یہی ہے۔ چنانچہ 'قانتین' وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ بندگی میں رہیں۔ غم، خوشی، جوش، ہیجان اور لذت والم کی کسی حالت میں بھی اپنے خالق سے سرکش نہ ہوں۔ شہوت کا زور، جذبات کی یورش اور خواہشوں کا ہجوم بھی انھیں خدا کے سامنے کبھی بے ادب نہ ہونے دے۔ ان کا دل خدا کا عرش ہو اور اس کی شریعت کو وہ حضوری میں دیا گیا حکم سمجھیں جس سے سرتابی کا تصور بھی دربار میں کھڑا ہوا کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ یہ، اگر غور کیجیے تو وہی کیفیت ہے جس کا اظہار یہ پورا عالم اور اس کی تمام مخلوقات ہر لحظہ زبان حال سے کر رہی ہیں:

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ، یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ الشَّمَآئِلِ، سُجَّدًا لِّلّٰہِ، وَ ہُمۡ دٰخِرُوۡنَ، وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ، وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ، وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ، یَخَافُوۡنَ رَبَّہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ، وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ. (النحل ۱۶: ۴۸-۵۰)

''اور کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے جو چیزیں بھی پیدا کی ہیں، اُن کے سایے دائیں اور بائیں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں اور ان پر فروتنی ہوتی ہے۔ اور زمین و آسمان میں جتنے جانور اور فرشتے ہیں، وہ بھی اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور کبھی سرکشی نہیں کرتے۔ وہ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ جو اُن سے اوپر ہے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انھیں دیا جاتا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

صدق

چوتھی چیز صدق ہے۔ یہ قول و فعل اور ارادہ، تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ آدمی کے منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، اس کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہ ہو اور وہ اپنی ہر بات کو نباہ دے تو یہ زبان اور عمل کی سچائی ہے، لیکن اس کے ساتھ نیت اور ارادے کی سچائی بھی لازماً شامل ہونی چاہیے۔ قرآن نے اس کے ضد کردار کو نفاق اور اسے اخلاص سے تعبیر کیا ہے پھر جگہ جگہ وضاحت فرمائی ہے کہ خدا کے نزدیک عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو کارگاہ قلب میں تیار کیا جائے، لہٰذا صدق کا درجۂ کمال قول و فعل اور ارادے کی اسی مطابقت سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں 'صَدَقُوۡا مَا عَاہَدُوا اللّٰہَ عَلَیۡہِ'[۸] (اللہ سے جو عہد انھوں نے باندھا، اُسے پورا کر دکھایا) کے الفاظ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ یعنی زبان کا حرف، دل کا ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا مظہر بن

---

[۸] الاحزاب ۳۳: ۲۳۔

جائے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا، وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ. (الحجرات ۴۹:۱۵)

''ایمان والے تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر کسی شک میں نہیں پڑے اور اپنے جان و مال کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے۔یہی صادقین ہیں۔''

صبر

پانچویں چیز صبر ہے۔یہ نفس کو اضطراب اور بے چینی سے روکنے کے لیے آتا ہے۔سورۂ حجرات کی آیت 'وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ'[۹] (اور اگر وہ تمھارے باہر نکلنے تک صبر سے کام لیتے) میں یہ اپنے اسی ابتدائی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔پھر اس سے مشکلات اور موانع کے علی الرغم پامردی، استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے موقف پر جمے رہنے کے معنی اس میں پیدا ہو گئے ہیں۔چنانچہ آیۂ زیر بحث میں جس صبر کا ذکر ہے، وہ عجز و تذلل کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جسے بے بسی اور درماندگی کی حالت میں مجبوراً اختیار کیا جائے، بلکہ عزم و ہمت کا سرچشمہ اور تمام سیرت و کردار کا جمال و کمال ہے۔اسی سے انسان میں یہ حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کے ناخوش گوار تجربات پر شکایت یا فریاد کرنے کے بجائے وہ انھیں رضامندی کے ساتھ قبول کرلے اور خدا کی طرف سے مان کر ان کا استقبال کرے۔اس مفہوم کے لحاظ سے 'صابر' وہ شخص ہے جو ہر خوف و طمع کے مقابل میں اپنے موقف پر قائم اور اپنے پروردگار کے فیصلوں پر راضی اور مطمئن رہے۔

اس کے تین مواقع قرآن میں بیان ہوئے ہیں: غربت، بیماری اور جنگ۔غور کیجیے تو تمام شدائد و مصائب کا منبع یہی تین چیزیں ہیں۔ارشاد فرمایا ہے:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ، وَالضَّرَّآءِ، وَحِيْنَ الْبَاْسِ. (البقرہ ۲:۱۷۷)

''اور جو تنگی، بیماری اور جنگ کے مواقع پر ثابت قدم رہیں۔''

اس آیت میں 'نصب علی المدح' کے طریقے پر صبر کو نمایاں کر کے قرآن نے بتا دیا ہے کہ سیرت و کردار کے معاملے میں اس کی اہمیت کس قدر غیر معمولی ہے۔اس کی مزید وضاحت قرآن مجید میں اس کے مواقع استعمال سے ہوتی ہے۔

۹؎ ۴۹:۵۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب دعوت حق کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ کو ہدایت کی گئی کہ لوگوں کی عداوت اور دشمنی کی پروا کیے بغیر پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہیں، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو جائے۔ آپ کو ہر حال میں اس فیصلے کا انتظار کرنا ہے۔ اس سے پہلے آپ کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔ قرآن میں یہ مفہوم اسی لفظ صبر سے ادا ہوا ہے:

وَاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ، وَاصۡبِرۡ حَتّٰى يَحۡكُمَ اللّٰهُ، وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ. (یونس ۱۰:۱۰۹)

''اور اُس وحی کی پیروی کرو جو تمھاری طرف کی جا رہی ہے اور صبر کے ساتھ انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔''

ایوب علیہ السلام پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، لیکن انھوں نے تسلیم و رضا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر ان کی مدح کی تو اس کے لیے بھی یہی تعبیر اختیار کی ہے:

اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا، نِعۡمَ الۡعَبۡدُ، اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ. (ص ۳۸:۴۴)

''ہم نے اُسے بہت صابر پایا، بہترین بندہ، وہ اپنے پروردگار کی طرف بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔''

لقمان کی نصیحت قرآن میں نقل ہوئی ہے۔ راہ حق کی مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے بیٹے کو اسی کی تلقین فرمائی ہے:

وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ، وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ، وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ، اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ. (لقمان ۳۱:۱۷)

''اور بھلائی کی تلقین کرو اور برائی سے روکو، اور جو مصیبت بھی پیش آئے اس پر صبر کرو۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔''

دعوت کی جدوجہد کے لیے اٹھنے والوں کو ایک اہم ہدایت قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ ان کے مخاطبین اگر ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی پر اتر آئیں تو بہتر یہی ہے کہ ان کی بدتمیزیوں کو نظر انداز کر کے وہ ان کی بدخواہی کا جواب بھی نیکی سے دیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کی جو صفت اس کے لیے آدمی کو اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہے، قرآن میں اس کے لیے صبر ہی کا لفظ آیا ہے:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ، وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ، وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ، اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ، وَهُوَ اَعۡلَمُ

''اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کرو اُس طریقے سے جو پسندیدہ ہو۔ بے شک، تمھارا پروردگار خوب جانتا ہے اُن کو بھی جو اس کی راہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بِالْمُهْتَدِيْنَ، وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ، وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ، لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ .(النحل۱۶: ۱۲۵۔۱۲۷)

سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں۔ اور اگر بدلہ لو تو اتنا ہی جتنی تکلیف تمھیں پہنچی ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہت ہی بہتر ہے۔''

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ، وَعَمِلَ صَالِحًا، وَّقَالَ: اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ، فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ، وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا، وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ.

(حٰم السجدہ۴۱: ۳۳۔۳۵)

''اور اس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں اور (یہ حقیقت ہے کہ) بھلائی اور برائی یکساں نہیں ہے۔ تم برائی کو اُس خیر سے دفع کرو جو بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے درمیان عداوت تھی، وہ گویا ایک سرگرم دوست ہے۔ اور (یاد رکھو کہ) یہ دانش انھی کو ملتی ہے جو صبر کریں اور انھی کو ملتی ہے جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میدان جنگ میں جب موت سامنے کھڑی ہوتی ہے، کلیجے منہ کو آتے ہیں اور آنکھیں خوف سے پتھرا جاتی ہیں تو جو لوگ بہادری اور استقامت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کریں اور ان کے پاے استقلال میں لغزش نہ آئے، ان کے لیے بھی یہی لفظ ہے:

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ، وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ.

(الانفال۸: ۶۶)

''لہٰذا تم میں سے اگر سو صبر کرنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ایسے ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر بھاری رہیں گے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ انھی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے جو فرائض اور ذمہ داریاں انسان پر عائد کی ہیں، انھیں عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ادا کیا جائے اور استاذ امام کے الفاظ میں جس طرح کسان اپنے کھیت میں ہل چلاتا، اس میں تخم ریزی کرتا، اس کو پانی دیتا اور برابر اس کی نگرانی کرتا ہے، اسی طرح بندۂ مومن اگر اپنے اس مبارک مزرعہ میں پوری محنت اور اس کی پوری حفاظت کرے تو اس کے لیے بھی یہی تعبیر ہے:

... رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا، فَاعْبُدْهُ، وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ. (مریم ۱۹: ۶۵)

''... زمین و آسمان اور اُن کے درمیان کی ہر چیز کا پروردگار، سو اُسی کی بندگی کرو اور صبر کے ساتھ اُسی کی بندگی پر قائم رہو۔''

رنج وراحت اور حزن و مسرت کے جو مواقع زندگی میں ہر شخص کو پیش آتے ہیں، ان میں اگر آدمی ضبط نفس سے کام لے، خوشی اور مسرت اس میں فخر و غرور پیدا نہ کرے اور غم و اندوہ کی حالت میں اس کے اندر مایوسی اور بددلی نہ ہو تو اس رویے کے لیے بھی قرآن میں یہی لفظ اختیار کیا گیا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً، ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ، اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ: ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ، اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ، اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ. (ہود ۱۱: ۹۔ ۱۱)

''اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازتے، پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے، اور اگر اُس مصیبت کے بعد جو اُس پر آئی تھی، اسے ہم نعمتوں سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے کہ میری مصیبتیں ختم ہوئیں، پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی ہیں جو صبر کرنے والے ہیں اور نیکوکار ہیں۔ یہی ہیں جن کے لیے مغفرت بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس سے واضح ہے کہ صبر مجبوری کے درگزر اور بے بسی کی خاموشی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس چیز کا نام ہے کہ بندۂ مومن ہر حال میں اپنے رب کے فیصلوں پر راضی رہے، نتیجۂ عمل میں تاخیر سے پریشان نہ ہو، اضطراب اور بے چینی سے بچا رہے، برائی کرنے والوں کے لیے بھی اپنے دل میں انتقام کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہونے دے، حق کی مدافعت کا موقع ہو تو موت کو سامنے دیکھ کر بھی ثابت قدم رہے، رنج وراحت کی ہر حالت میں ضبط نفس سے کام لے اور جس چیز کو فرض و واجب سمجھے، تمام عمر اس کی پابندی کرتا رہے۔

انسان کی سیرت کا یہی پہلو ہے جس سے خدا اور بندے کے درمیان وہ تعلق قائم ہوتا ہے جسے توکل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ہر حال میں خدا ہی پر بھروسا کیا جائے۔ 'اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ' اسی تفویض اور سپردگی کا کلمہ ہے۔ قرآن کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص الطاف و عنایات ہیں جو اس کلمے پر قائم رہتے اور اسی پر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ، قَالُوۡٓا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ. اُولٰٓئِكَ عَلَیۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ.

(البقرہ۲: ۱۵۵۔۱۵۷)

''اور (اِس میں) جو ثابت قدم ہوں گے، اُنھیں (کامیابی کی) بشارت دو۔ (وہی) جنھیں کوئی مصیبت پہنچے تو کہیں کہ لاریب، ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں (ایک دن) اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی عنایتیں اور اس کی رحمت ہوگی اور یہی ہیں جو (اُس کی) ہدایت سے بہرہ یاب ہونے والے ہیں۔''

خشوع

چھٹی چیز خشوع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اس کی عظمت وجلال کے صحیح تصور سے جو تواضع، عجز اور فروتنی انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے، قرآن اسے خشوع سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایک قلبی کیفیت ہے جو اسے خدا کے سامنے بھی جھکاتی ہے اور دوسرے انسانوں کے لیے بھی اس کے دل میں رحمت ورأفت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

پہلی صورت میں اس کا بہترین اظہار نماز، بالخصوص شب کی نمازوں میں ہوتا ہے، جب بندۂ مومن دنیا کی سب چیزوں سے الگ ہو کر تنہا اپنے پروردگار سے سرگوشیاں کرتا اور اپنی تنہائیوں کو اس کے ذکر وشکر سے معمور کر دیتا ہے۔ قرآن کے بعض دوسرے مقامات پر 'مستغفرین بالاسحار'[80] (پچھلی رات کو اٹھ کر اپنے گناہوں کی مغفرت چاہنے والے) اور 'والذین یبیتون لربھم سجداً وقیاماً'[81] (جو راتیں اپنے پروردگار کے آگے سجود اور قیام میں گزارتے ہیں) جیسے اسالیب میں اسے ہی بیان کیا گیا ہے۔ صدقے اور روزے سے متصل پہلے اسے رکھ کر یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ترتیب بیان سے اسی جانب اشارہ کیا ہے اور نماز کو گویا اس کی حقیقت سے تعبیر کر دیا ہے۔ تہجد کی نماز میں یہ حقیقت، جیسا کہ بیان ہوا، سب سے بڑھ کر نمایاں ہوتی ہے۔ قرآن کے اشارات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضوری کا وقت ہے اور خدا سے محبت کرنے والوں کو ہمیشہ بہت محبوب رہا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... پرسکون اور سکون بخش ہونے کے لحاظ سے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت بھی اس کا مقابلہ نہیں

۸۰؎ آل عمران۳: ۱۷۔

۸۱؎ الفرقان۲۵: ۶۴۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کرسکتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک سکون ہی سکون ہوتا ہے۔ اس وقت سب سو رہے ہوتے ہیں۔ شاید شیطان بھی سو رہا ہوتا ہے۔ صرف وہ رب غفار وکریم جاگتا ہے جو کبھی نہیں سوتا یا پھر وہ جاگتا ہے جس کا بخت بیدار ہوتا ہے۔ اٹھیے اور ستاروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو جایے تو فی الواقع محسوس ہوگا کہ آسمان کے دریچے کھلے ہوئے ہیں اور سماے دنیا سے توبہ اور رحمت کی منادی ہو رہی ہے۔ اس وقت کی کیفیات ایسی واضح ہیں کہ اس کو دنیا دار اور دین دار، رند اور زاہد، دونوں ہی جانتے ہیں۔ سونے والے اس کو سونے کے لیے بہترین وقت سمجھتے ہیں اور جاگنے والے اس کو جاگنے کے لیے، سب سے بہتر وقت سمجھتے ہیں اور فی الحقیقت ان دونوں کا سمجھنا صحیح ہے۔ جو وقت سونے کے لیے سب سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوگا، وہی جاگنے کے لیے بھی سب سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوگا۔ قربانی تو عزیز ومحبوب ہی کی مقبول ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت کو اللہ تعالیٰ نے بھی مقربین کی نماز کے لیے خاص کیا ہے۔ جن کے پہلو اس وقت بستر کی لذت کو چھوڑتے ہیں، ان کی التجائیں اور دعائیں سننے کے لیے وہ خود سماے دنیا پر اترتا ہے اور فرماتا ہے کہ ہے کوئی توبہ کرنے والا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی میری رحمت کا طالب کہ میں اس کو اپنی رحمت کے دامن میں چھپا لوں؟'' (تزکیۂ نفس ۲۴۳)

دوسری صورت میں یہ کیفیت بندۂ مومن کی پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتی اور اسے اپنے اہل وعیال کے لیے سراپا شفقت، اپنے دوستوں، پڑوسیوں اور ملنے والوں کے لیے سراسر رحمت اور اپنے معاشرے کے لیے ایک سرچشمۂ ہدایت بنا دیتی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی حلیم اور مہربان انسانوں سے وہ تمدن وجود میں آتا ہے جو زمین پر خدا کی جنت اور ہر سلیم الفطرت انسان کا مطمح نظر اور اس کی آرزوؤں کا محور ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ انھی نفوس قدسیہ کا ذکر ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا، وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ، قَالُوْا: سَلٰمًا، وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا، وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ: رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ، اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا، اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا...وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا. (الفرقان ۲۵: ۶۳-۷۲)

''رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں اور جاہل اُن سے الجھیں تو ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور جو اپنی راتیں اپنے پروردگار کے حضور سجود و قیام میں گزارتے ہیں اور جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو دوزخ کے عذاب سے ہم کو بچا لے۔ اس کا عذاب تو بالکل چمٹ جانے کی چیز ہے۔ وہ بڑا ہی برا مستقر ہے، اور بڑا ہی برا مقام ہے... اور کسی بے ہودہ چیز پر گزر ہو تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بڑے وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔''

صدقہ

ساتویں چیز صدقہ ہے۔ اللہ کی راہ میں انفاق کا ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مال میں سے فرض زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی ذاتی اور کاروباری ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہو، اسے معاشرے کا حق سمجھے اور جب کوئی مطالبہ سامنے آئے تو اسے فراخ دلی کے ساتھ پورا کر دے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضرورتوں میں ایثار کر کے بھی وہ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے 'وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ، وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'[۸۲] (وہ اُن کو احتیاج کے باوجود اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ صدقہ دینے والوں کی تعبیر ان سب صورتوں کو شامل ہو سکتی ہے، لیکن بیان اوصاف کے موقع پر جب کسی شخص کو 'متصدق' کہا جائے گا تو اس سے اشارہ اصلاً اس کے درجۂ کمال ہی کی طرف ہوگا۔ یعنی جو سخی اور فیاض ہو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دے۔ بندوں کے تعلق سے یہ اسی خشوع کا ظہور ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے۔ نماز اور انفاق کا ذکر قرآن میں اسی بنا پر ساتھ ساتھ آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روزہ

آٹھویں چیز روزہ ہے۔ یہ ضبط نفس اور تربیت صبر کی خاص عبادت ہے۔ قرآن میں اس کا مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ اس سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ 'صائمین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے ایسے حریص ہیں کہ اس کے لیے زیادہ تر روزے سے رہتے ہیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ معلوم ہوئی کہ وہ منکرات سے بچتے، فواحش سے اجتناب کرتے اور اپنی زندگی میں تمام اخلاق عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔

حفظ فروج

نویں چیز حفظ فروج ہے۔ یعنی جو شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ضبط نفس اور تقویٰ کا ثمرہ ہے۔ برہنگی، عریانی اور فواحش سے اجتناب کرنے والوں کے لیے یہ تعبیر قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی آئی ہے۔

۸۲؎ الحشر ۵۹: ۹۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عفت وعصمت کی بالکل آخری درجے میں حفاظت کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے جہاں اجازت دی ہے، اس کے سوا خلوت وخلوت میں اپنا ستر وہ کسی کے سامنے نہیں کھولتے اور نہ کوئی ایسا لباس کبھی پہنتے ہیں جو ان اعضا کو نمایاں کرنے والا ہو جو اپنے اندر کسی بھی لحاظ سے جنسی کشش رکھتے ہیں۔ فواحش سے اجتناب کا یہی درجہ ہے جس سے وہ تہذیب پیدا ہوتی ہے جس میں حیا فرماں روائی کرتی اور مرد وعورت، دونوں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ کھولنے کے بجائے، جہاں تک ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھنے کے لیے مضطرب ہوتے ہیں۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پروفیسر خورشید عالم

''محدث'' کی کرم فرمائیاں

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''محدث'' کا اگست ۲۰۰۵ کا شمارہ خاصی دیر سے مہینے کے آخر میں نکلا۔ اس میں ایک صاحب پروفیسر ضیاء اللہ برنی نے امامت زن کے مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ حسب عادت وہ اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ آدمی جب دلائل سے عاجز آ جاتا ہے تو ذاتیات پر اتر آتا ہے، طعنے دینے شروع کر دیتا ہے۔ عمر گزیدگی کا طعنہ (خدا کا شکر ہے کہ مردم گزیدہ نہیں، ورنہ غالب کی طرح آئینے سے بھی ڈرتا رہتا)، فن حدیث سے ناواقفیت کا طعنہ، کج بحثی کا طعنہ، صداقت و امانت کو چھوڑنے کا طعنہ، من گھڑت موقف کا طعنہ اور نہ جانے کون کون سے طعنے۔ میرے بھائی طعنوں سے تحقیقی مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ بہر کیف ان طعنوں کا جواب طعنوں سے دینے کی بجائے میں قرآن مجید کی اس ہدایت پر عمل کروں گا کہ اگر تم صبر کرو تو صبر تمھارے لیے بہتر ہے۔

سب سے پہلے میں اس افترا پردازی کا جواب دینا چاہتا ہوں جس میں قرآن کالج سے میری باعزت فراغت کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا، صرف ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کے مراسلہ نمبر ۵۳/۰۵ مورخہ ۵ مئی ۲۰۰۵ کا حوالہ دوں گا جس کے الفاظ یہ ہیں: ''قرآن کالج کے لیے آپ کی گراں قدر تدریسی

ذمہ داریاں قابل تحسین ہیں، لیکن آپ کی طویل العمری اور صحت کے پیش نظر مرکزی انجمن کی انتظامیہ نے طے کیا ہے کہ آپ کو قرآن کالج کی تدریسی ذمہ داریوں سے ریٹائر کر دیا جائے۔'' ناظم اعلیٰ کے دفتر سے اس چٹھی کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ رہی ساتھ رہنے والے نمازیوں کے ساتھ میرے متشددانہ طرز عمل کی بات تو اس کے جواب میں اتنا ہی کہوں گا۔'یا ایھا الذین اٰمنوا ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا' (۶:۴۹) ''ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلیا کرو۔'' مضمون نگار سے گزارش ہے کہ وہ ایل بلاک کی مسجد الہدیٰ میں تشریف لائیں اور دیکھیں کہ نمازیوں کے ساتھ میرا سلوک کیسا ہے اور وہ میرا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ہاں اس مسجد میں ایک نکاح خواں خطیب ہیں جو عربی زبان سے قطعی ناآشنا ہیں۔ خطبۂ جمعہ میں زیر زبر کی غلطیاں اکثر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اصلاح ضرور کرتا رہتا ہوں۔

اب کچھ مضمون نگار کی علمی غلط فہمیوں کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کروں گا۔

مجھے فن حدیث سکھانے سے پہلے میرے اس سوال کا جواب مضمون نگار کے ذمہ ہے کہ حدیث ام ورقہ کو ابن خزیمہ اور علامہ عینی کے پائے کے ناقدین نے صحیح قرار دیا ہے اور عصر حاضر کے سب سے بڑے محدث ناصر الدین البانی نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے حسن کہا ہے تو آپ کے شیخ الحدیث ثناء اللہ اسے کس بنا پر ضعیف قرار دے رہے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق اس کے راوی ولید بن عبداللہ بن جمیع پر ناقدین نے کلام کیا ہے، مگر کسی نے اس حدیث کو ضعیف قرار نہیں دیا۔

مضمون نگار نے اعتراض کیا ہے کہ سنن ابی داؤد کی روایت کو قبول کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی سند میں بھی ولید ہے اور دار قطنی کی دوسری روایت میں بھی وہی راوی ہے، اسے قبول کیوں نہیں کیا جاتا۔ اگر مضمون نگار نے میرا جواب اچھی طرح پڑھا ہوتا تو وہ یہ اعتراض نہ اٹھاتے۔ سنن ابی داؤد کی روایت اس لیے ثقہ ہے کہ یہ روایت ولید نے اپنی دادی سے کی ہے جو ثقہ ہیں، جبکہ سنن دار قطنی کی دوسری روایت ولید نے اپنی والدہ سے کی ہے جو مجہول الحال ہے۔

سنن دار قطنی کی روایت کے بارے میں مقالہ نگار کا دعویٰ ہے کہ 'کانت تؤم' کے الفاظ کہیں بھی موجود نہیں۔ کاش صاحب مضمون نے سنن دار قطنی کو کبھی کھول کر دیکھا ہوتا! تو وہ یہ دعویٰ کبھی نہ کرتے۔ اب برنی صاحب سنن دار قطنی مطبوعہ عالم الکتب بیروت جلد ا:۴۰۳ کھولیں، وہاں ان کو باب صلاۃ النساء جماعۃ کے تحت یہ حدیث لکھی ہوئی ملے گی: 'عن ام ورقۃ وکانت تؤم ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آذن لھا ان تؤم

اھل دارھا' مجھے امید ہے کہ حدیث کے الفاظ سے مقالہ نگار کو ثبوت مل جائے گا۔ انھوں نے مجھ پر جو ناروا الزام لگایا ہے، وہ بارگاہ خداوندی میں اس کے جواب کے لیے تیار رہیں۔ میں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط الفاظ کی نسبت کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ہاں مضمون نگار نے یہ کہہ کر کہ سنن دارقطنی میں اس حدیث کی عبارت میں 'نساء اھل دارھا' کی صراحت آ گئی ہے، غلط الفاظ کو رسالت مآب کی طرف منسوب کیا ہے۔ کیونکہ سنن دارقطنی کی دونوں روایات میں یہ الفاظ قطعی موجود نہیں۔ مذکورہ بالا روایت میں بھی 'تؤم اھل دارھا' کے الفاظ ہیں اور دوسری روایت میں بھی جو حدیث کی کسی کتاب میں موجود نہیں 'تؤم نساءھا' (اپنی عورتوں کی امامت کرے) کے الفاظ ہیں۔ اس لیے میرا یہ خیال غلط نہیں کہ ضیاء اللہ برنی صاحب نے سنن دارقطنی کا نام تو سن رکھا ہے، مگر کبھی پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

میرے بھائی صرف اہل ''اشراق'' کے استدلال کا محور حدیث ام ورقہ نہیں، بلکہ امام ابوثور، مزنی، امام طبری (اور ایک روایت کے مطابق امام داؤد ظاہری) کے استدلال کا محور بھی یہ صحیح حدیث ہے۔ ذرا ''بدایۃ المجتہد'' اور ''المغنی'' کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، وہاں آپ کو اس اختلاف کا ذکر ملے گا۔ یہ مسئلہ متفقہ نہیں، بلکہ اس میں اختلاف پایا جاتا ہے جو صحیح حدیث پر مبنی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ام ورقہ عورتوں اور مردوں کی امامت کرتی تھیں، یہ احتمال نہیں، بلکہ یقینی بات ہے جس پر حدیث کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ام ورقہ کو اجازت دی گئی کہ ان کے لیے اذان دی جائے اور اقامت کہی جائے۔ نیز ان کا موذن ایک بوڑھا آدمی تھا اور ان کے گھر میں ایک غلام اور لونڈی بھی تھی۔ اگر لفظ دار کو بیت تک محدود کر دیا جائے تب بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ موذن اور غلام ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کیا موذن اقامت کہنے کے بعد ان کے پیچھے سے بھاگ جاتا تھا؟ اسی لیے امیر صنعانی (متوفی ۱۱۸۲) نے ''بلوغ المرام'' کی شرح ''سبل السلام'' میں فرمایا ہے کہ عورت اپنے اہل خاندان کی امامت کرے گی، خواہ اس میں مرد ہی کیوں نہ ہو۔ (۲:۳۰)

مقالہ نگار نے ایک بات ایسی کہی ہے جس پر عذر گناہ بدتر از گناہ کا قول صادق آتا ہے۔ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے کویت کے الموسوعۃ الفقھیہ کے حوالے سے ذکر کیا تھا کہ عزت عبید وعاس کی تحقیق سے شائع ہونے والے نسخہ میں 'ان تؤم نساء اھل دارھا' (وہ اپنے اہل محلّہ کی عورتوں کی امامت کریں) کے الفاظ درج ہیں۔ میں نے اس نسخہ کو دیکھا تو اس میں یہ الفاظ سرے سے موجود نہ تھے۔ چنانچہ میں نے لکھا کہ حافظ صاحب کو اتنی

بڑی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ مقالہ نگار کو یہ الفاظ بہت کھلے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق یہ حوالہ کویت کے الموسوعۃ الفقہیہ میں تو موجود ہے، اگر اصل ماخذ میں حوالہ موجود نہیں تو کیا ہوا؟ گویا اگر کسی بڑی کتاب میں غلط حوالہ ہو تو اسے بغیر تحقیق کے قبول کر لینا چاہیے۔ حافظ صاحب اہل حدیث کے بڑے ہیں۔ ان پر واجب تھا کہ وہ ایک ایسے حوالہ کی جو سب کتب حدیث سے متصادم ہے، اصل کتاب سے جو بآسانی دست یاب ہے، تحقیق کر لیتے۔ انھوں نے بغیر سوچے سمجھے اس حوالہ کو مان لیا جو ان کے ذہنی تحفظات کی تائید کرتا تھا۔

''اشراق'' کے اگست کے شمارے میں میرا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کا عنوان ہے ''چہرے کا پردہ''۔ اس میں میں نے کتاب وسنت کی روشنی میں مفسرین، محدثین اور لغویین کی رائے کو پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ جمہور علما کی رائے میں عورت کے لیے چہرے کا پردہ واجب نہیں، لیکن صاحب مضمون نے جذبات بھڑکانے کے لیے ''مرد و زن کے اختلاط کے جواز'' کا اضافہ اپنی طرف سے کیا ہے۔ یہ بہتان ہے، اللہ ان کو ہدایت دے۔ اس قسم کی الزام تراشیوں کو دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا تھا — کار ملا فی سبیل اللہ فساد — رہی یہ بات کہ یہ نیا انحراف ہے تو اس انحراف کے مرتکب وہ سب ائمۂ کرام ہیں جن کا حوالہ میں نے اپنے مضمون میں دیا ہے۔ اس مضمون پر اپنی رائے زنی سے پہلے وہ دور حاضر کے سب سے بڑے محدث ناصر الدین البانی کی کتاب ''حجاب المراۃ المسلمۃ'' اور ''جلباب المراۃ المسلمۃ'' پڑھ لیں۔ ان کی تسلی ہو جائے گی۔ محدث البانی سلفی کا مرتبہ اور مقام کیا ہے؟ جماعت اہل حدیث کے کسی پڑھے لکھے آدمی سے پوچھ لیں۔

رفیع اللہ شہاب مرحوم (ایک مسلمان کو آنجہانی کہتے ہوئے خدا کا خوف آنا چاہیے) گردن زدنی تھے، کیونکہ ان کو غلام احمد پرویز سے نسبت تھی۔ میں گردن زدنی ہوں، کیونکہ مجھے جاوید احمد غامدی سے نسبت ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی پارسا جنت کا اجارہ دار ہے تو وہ مذہبی پیشوا ہے جو کہتا ہے — مستند ہے میرا فرمایا ہوا — خواہ اس کا فرمایا ہوا کتنا ہی غیر معقول اور کتاب وسنت سے متصادم ہی کیوں نہ ہو۔ یہ پارسائی آپ کو مبارک ہو۔

اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

اگر جاوید احمد غامدی سے نسبت طعنہ ہے تو مجھے اس پر فخر ہے کہ میں فکر فراہی سے منسوب ہوں۔ میں انحراف کی راہیں نہیں کھولتا۔ میں تو آپ لوگوں کے ان ذاتی خیالات اور میلانات سے پردہ اٹھاتا ہوں جن کو آپ لوگوں نے کتاب وسنت کا لبادہ پہنا کر وحی کا درجہ دے رکھا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میرے بھائی، میرے دوست، میرے برخوردار اختلاف رائے کو اس طرح برداشت کیجیے جیسے ہمارے اسلاف نے برداشت کیا۔ بدگمانی، افترا پردازی اور الزام تراشی سے تحقیقی مسائل حل نہیں ہوتے۔ اس کے لیے مطالعہ، عرق ریزی، محنت اور نیک نیتی درکار ہے۔

ادارۂ ''اشراق'' کے بارے میں مضمون نگار نے جو ''موتی'' بکھیرے ہیں، ان کو پڑھ کر اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ''محدث'' کا نام کتنا بلند ہے اور کام؟۔ و ما توفیقی الا باللّٰہ العظیم۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الطاف احمد اعظمی

اسلام کا تصور عبادت

— ۲ —

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریاضات شاقہ

ہر قوم کے غالی مذہبی لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ عبادت میں جتنی زیادہ جسمانی مشقتیں اٹھائی جائیں اور جسم کو اذیت میں مبتلا کیا جائے اتنا ہی زیادہ اللہ خوش اور راضی ہوتا ہے۔ اس سے پہلے عیسائی رہبان کی ریاضات شاقہ کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ بعض مسلم صوفیا بھی عیسائی رہبان کے نقش قدم پر چلے ہیں[۴۲]۔ لیکن اسلام کی تعلیم اس معاملے میں نہایت سادہ، آسان اور مطابق فطرت ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

مَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡ الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ . (الحج ۲۲:۷۸)

''اور اس نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

ایک دوسری جگہ وضو اور تیمّم کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے:

۴۲؎ ایک صوفی بزرگ بیس سال تک مستقل کھڑے رہے صرف نماز میں تشہد کے لیے بیٹھتے تھے۔ (کشف المحجوب ۲۹۲) سری ایک بڑے عبادت گزار صوفی گزرے ہیں۔ وہ اٹھانوے برس تک زندہ رہے اور سوائے مرض الموت کے کبھی لیٹے نہیں۔ (احیاء العلوم ۴/ ۳۴۹) ایک چشتی بزرگ خواجہ ابو محمد اپنے مکان کے ایک گہرے کنویں میں الٹا لٹک کر عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ (سیر الاولیاء ۴۰) مزید معلومات کے لیے قارئین ابن الجوزی کی کتاب ''تلبیس ابلیس'' ملاحظہ کریں۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ ۵:۶)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی ڈالے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔''

ماہ صیام میں بیماری اور سفر کی حالت میں روزے کا حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (البقرہ ۲:۱۸۵)

''اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمھارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اس پر اس کی بڑائی کرو، اور تاکہ تم اس کے شکر گزار بنو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں صحابہ کو تلقین کی ہے کہ وہ دین میں میانہ وری اختیار کریں اور عبادت میں غیر ضروری مشقت سے کام نہ لیں کہ یہ عیسائی رہبان کا طریقہ ہے، فرمایا:

ان الدين يسر، ولن يشاد الدين احد الا غلبه فسددوا وقاربوا وأبشروا... الخ[۴۳]

''دین آسان ہے، جو کوئی دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو وہ اس پر غالب آ جائے گا۔ پس راہ راست دکھاؤ، میانہ روی اختیار کرو اور خوش خبری دو... الخ۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کو یمن کا امیر بنا کر بھیجا تو دوسری باتوں کے علاوہ یہ نصیحت بھی کی:

يسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا.[۴۴]

''تم دونوں آسانی پیدا کرنا، تنگی پیدا نہ کرنا، خوش خبری دینا، نفرت نہ دلانا، اور خوشی سے ایک دوسرے کی تابع داری کرنا، اختلاف نہ کرنا۔''

آسانی اور سادگی ہی اسلام کی روح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الا هلك المتنطعون، الا هلك المتنطعون، الا هلك المتنطعون.[۴۵]

''سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے، سن لو، غلو کرنے والے ہلاک ہوئے، سن لو، غلو کرنے والے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

---

۴۳ رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر۔

۴۴ رواہ البخاری، کتاب الایمان، باب: الدین یسر۔

ہلاک ہوئے۔‘‘

اسلام میں وہی عبادت محمود ہے جو آسانی کے ساتھ، مگر پابندی سے کی جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اکلفوا من العمل ما تطیقون فان اللّٰہ لا یمل حتی تملوا، فان احب العمل الی اللّٰہ ادومہ وان قل۔[46]

’’اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو بآسانی کر سکو کیونکہ جب تک تم نہ اکتا جاؤ خدا نہیں اکتا تا۔ خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ کام وہ ہے جو برابر انجام پائے اگرچہ قلیل ہو۔‘‘

حضرت عائشہ نے جب رسول اللہ کو بتایا کہ خولاء بنت تویت نے پختہ ارادہ کرلیا ہے کہ وہ رات بھر نہیں سوئے گی اور عبادت کرے گی تو آپ نے فرمایا:

لا تنام اللیل؟ خذوا من العمل ما تطیقون، فواللّٰہ لا یسأم اللّٰہ حتی تسأموا۔[47]

’’رات میں نہیں سوئے گی؟ اتنا ہی عمل کرو جتنے کی طاقت رکھتے ہو۔ خدا کی قسم اللہ نہیں اکتا تا جب تک کہ تم نہ اکتا جاؤ۔‘‘

انس روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک رسی دو ستونوں کے درمیان بندھی ہوئی ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ زینب کی رسی ہے۔ دوران نماز جب وہ تھکن محسوس کرتی ہیں یا وقفہ دینا چاہتی ہیں تو اس کو پکڑ لیتی ہیں۔ فرمایا، اس کو کھول دو۔ تم میں سے ہر شخص کو اس وقت تک نماز پڑھنا چاہیے جب تک طبیعت میں تازگی محسوس ہو۔ جب تھک جاؤ یا وقفہ دینا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔[48]

ایام جاہلیت میں مناسک حج کے اندر بعض باتیں رہبانیت کی داخل ہوگئی تھیں، جو دراصل عیسائی رہبان کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اسلام کے بعد بھی بعض لوگ ان اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی کہ وہ پیدل چل کر حج کریں گی۔ عقبہ نے اس بارے میں رسول اللہ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا، خدا کو تمھاری بہن کی اس نذر کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔[49]

۴۵؎ رواہ مسلم واحمد وابوداؤد۔

۴۶؎ ابوداؤد، باب: القصد فی الصلوٰۃ۔

۴۷؎ رواہ البخاری، باب: التہجد باللیل، باب: ما یکرہ من التشدید فی العبادۃ۔

۴۸؎ ایضاً

۴۹؎ سنن ابی داؤد، کتاب الایمان والنذور، باب: من رای علیہ کفارۃ اذا کان فی معصیۃ۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آپ نے دیکھا کہ ایک شخص بڑھاپے کی وجہ سے چل نہیں سکتا، اس کے بیٹے دونوں طرف سے اس کو پکڑے ہوئے چلا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا، خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو۔[50] اسی طرح ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے تو دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ نے پوچھا، یہ کون شخص ہے اور وہ کیوں دھوپ میں کھڑا ہے؟ صحابہ نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا، بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ نے فرمایا، اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام کرے اور اپنا روزہ پورا کرے۔[51]

عمار بن یاسر بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ نہایت گرمی کے دنوں میں سفر شروع ہوا تھا۔ راستے میں ہم ایک جگہ ٹھہرے۔ ہم میں سے ایک شخص نکلا اور جلدی سے درخت کے سائے میں چلا گیا۔ دوسرے لوگ تو درخت کے سائے میں آرام کر رہے تھے اور وہ اس طرح سویا ہوا تھا جیسے اذیت میں مبتلا ہو۔ رسول اللہ نے دیکھا تو پوچھا، تمھارے ساتھی کو کیا ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا، وہ روزے سے ہے۔ آپ نے فرمایا:

لیس من البر ان تصوموا فی السفر وعلیکم بالرخصة التی رخص اللّٰہ لکم فاقبلوھا۔[52]	''یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم سفر میں روزہ رکھو، اللہ کی دی ہوئی رخصت کو لازم جانو اور اس پر عمل کرو۔''

حضرت انس سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ ہم میں روزہ دار بھی تھے اور بے روزہ دار بھی۔ ہم نے ایک منزل پر قیام کیا۔ دن نہایت گرم تھا۔ جو روزہ دار تھے وہ تو زمین پر پڑ رہے اور جو لوگ روزہ سے نہیں تھے انھوں نے خیمے نصب کیے اور جانوروں کو پانی پلایا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا:

ذھب المفطرون الیوم بالاجر۔[53]	''آج اجر میں بے روزہ دار بازی لے گئے۔''

ابوداؤد روایت کرتے ہیں کہ وہ اور ان کے والد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانۂ امارت میں انس بن مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہے تھے، نہایت ہلکی نماز گویا کہ مسافر کی نماز ہو۔ جب انھوں نے

۵۰؎ ایضاً، مزید دیکھیں بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فیما لا یملک وفی معصیة۔

۵۱؎ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب: النذر فیما لا یملک وفی معصیة۔

۵۲؎ رواہ الطبرانی فی الکبیر باسناد حسن۔

۵۳؎ رواہ احمد ومسلم وابوداؤد۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

سلام پھیرا تو والد نے پوچھا: اللہ آپ پر رحم کرے، کیا یہ فرض نماز تھی یا نفل؟ انھوں نے کہا، یہ فرض نماز تھی، اور یہ رسول اللہ کی نماز تھی۔ میں نے اس میں کوئی خطا نہیں کی ہے بجز بھول چوک کے۔ رسول اللہ فرماتے تھے:

لا تشددوا علی انفسکم فشدد علیکم، فان قوما شددوا علی انفسهم فشد اللّٰه علیهم، فتلك بقایاهم فی الصوامع و الدیار: رهبانية ابتدعوها ما کتبنا علیهم...الخ۔[۵۴]

''اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ وہ تم پر سختی کرے۔ ایک قوم نے اپنے نفوس پر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی فرمائی۔ یہ صومعے اور خانقاہیں ان ہی کی یادگار ہیں۔ پھر (سورۂ حدید کی) یہ آیت پڑھی: رهبانية ابتدعوها... الخ۔''

انس بن مالک روایت کرتے ہیں کہ معاذ بن جبل ایک قبیلے کے امام تھے۔ حرام (ابن ملحان) نماز سے فارغ ہو کر اپنے باغ کو سینچنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ لوگوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئے اور نماز میں شریک ہو گئے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ معاذ نماز کو طول دے رہے ہیں تو وہ نماز مختصر کر کے اپنے باغ میں چلے گئے تاکہ اس کو سینچیں۔ جب معاذ نے نماز ختم کی تو انھیں یہ بات بتائی گئی۔ یہ سن کر انھوں نے کہا کہ وہ منافق ہے۔ کیا وہ باغ کو سینچنے کے لیے نماز میں عجلت کرتا ہے۔ جب حرام کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے (اور معاذ بھی آئے) اور کہا: اے اللہ کے نبی، میرا ارادہ یہ تھا کہ اپنے باغ کو سینچوں۔ چنانچہ میں مسجد میں آیا تاکہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھوں، لیکن جب انھوں (معاذ) نے نماز کو طول دیا تو میں اپنی نماز مختصر کر کے باغ میں چلا گیا تاکہ اسے سینچوں۔ انھوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ میں منافق ہوں۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کی طرف دیکھا اور فرمایا، کیا تو فتنہ پھیلانے والا ہے، کیا تو فتنہ پھیلانے والا ہے؟ (أ فتان أنت، أفتان أنت) ان کو لمبی نماز نہ پڑھایا کرو۔ 'سبح اسم ربك الاعلیٰ' اور 'و الشمس و ضحاها' وغیرہ پڑھایا کرو۔[۵۵]

دیکھیں کہ ایک شخص طول نماز کی وجہ سے اپنی نماز مختصر کر کے جماعت سے الگ ہو جاتا ہے، لیکن رسول اللہ اس کو ذرا بھی ملامت نہیں کرتے، بلکہ الٹا حضرت معاذ بن جبل جیسے صحابی کو تنبیہ فرماتے ہیں اور یہ سخت الفاظ ارشاد فرماتے ہیں: 'أفتان أنت، أفتان أنت'؟

۵۴؎ سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب: فی الحد۔

۵۵؎ رواہ احمد باسناد صحیح۔ یہ قصہ صحیحین وغیرہ میں بھی لفظی فرق کے ساتھ مذکور ہے۔ دیکھیں بخاری، باب: اذا طول الامام وکان للرجل حاجۃ۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس واقعے سے صاف طور پر دین اسلام کا مزاج معلوم ہو جاتا ہے۔ اور وہ مزاج یہ ہے کہ عبادت میں غلو سے پرہیز کیا جائے۔ اللہ کو اپنے بندوں سے جسمانی ریاضتیں نہیں، تقویٰ مطلوب ہے۔ یہ غلو ہی تو تھا جس نے ماضی میں قوموں کو ہلاک کیا ہے، ابن عباس فرماتے ہیں:

ایاکم والغلو، فان اھلك من کان قبلکم الغلو۔[56]	''غلو سے بچو، تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو غلو ہی نے ہلاک کیا۔''

اشکال و رسوم عبادت

ہر قوم میں عبادت کے کچھ طریقے اور مراسم مقرر ہیں جن کی لوگ دوران عبادت پابندی کرتے ہیں۔ یہ طریقے اور رسمیں مقصود عبادت یعنی خدا کی یاد اور اس کی اطاعت و بندگی کے اظہار کے لیے مقرر کی گئی تھیں۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ عبادت کے اشکال و مراسم ہی کو اصل اہمیت حاصل ہو گئی اور مقصود عبادت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ بھی ہوا ہے کہ اشکال عبادت کے اختلاف کی وجہ سے مذہبی نزاعات پیدا ہوئے، ایک قوم نے دوسری قوم کو گم راہ قرار دیا اور بسا اوقات نوبت جدال تک پہنچ گئی۔ آج بھی مختلف قوموں کے درمیان مذہبی اختلافات کی ایک بڑی وجہ عبادت کے اشکال و اعمال کا اختلاف ہی ہے۔

ماضی میں یہود و نصاریٰ نے اس معاملہ میں کافی غلو کا مظاہرہ کیا ہے۔ قبلۂ عبادت کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک نے دوسرے کو گم راہ اور بے دین قرار دیا اور باہم اختلاف و نزاع کی آگ اس شدت کے ساتھ بھڑکی کہ ان کے عبادت خانے بھی اس کے شعلوں سے محفوظ نہ رہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ أَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا أُوْلٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَّدْخُلُوْهَا إِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ. (البقرہ ۲: ۱۱۴۔۱۱۵)	''اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کے ذکر سے روکیں اور ان کی ویرانی کے درپے ہوں۔ ان کے لیے زیبا نہ تھا کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں بڑی سزا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ موجود ہے۔ اللہ وسعت والا اور علم والا ہے۔''

۵۶؎ رواہ مسلم۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہود نے اس کوتاہ اندیشی اور ظاہر پرستی کا مظاہرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بھی اس وقت کیا جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ انھوں نے اس تبدیلی پر کافی شوروغوغا برپا کیا۔ ان نادانوں کو بتایا گیا کہ سمت قبلہ کا اختلاف دین میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا، اصل اہمیت نیکی کو حاصل ہے اور یہی اس کا مغز و جوہر ہے اس لیے اس کے حصول میں مسابقت کی جائے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ. (البقرہ ۲: ۱۴۸)

اسی سورہ میں آگے چل کر اس حقیقت کو ان لفظوں میں مزید واضح کیا گیا ہے:

لَّيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيّٖنَ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوْا وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۷۷)

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روز آخرت پر، کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان رکھے۔ اور مال کی حاجت و محبت کے باوجود اس کو رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے۔ نیز گردن چھڑانے میں خرچ کرتا ہو اور نماز قائم کرتا ہو اور زکوٰۃ دیتا ہو، اور جو لوگ عہد کر لینے کے بعد عہد کو پورا کرتے ہوں، اور تنگ دستی، بیماری اور جنگ میں ثابت قدم رہتے ہوں۔ ایسے ہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ فی الواقع خدا ترس ہیں۔“

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسری قوموں کی طرح مشرکین عرب بھی مذہبی اعمال و رسوم کی پیروی کو مقصود عبادت سمجھتے تھے۔ چنانچہ دستور کے مطابق وہ حج سے واپسی پر اپنے گھروں میں پیچھے سے داخل ہوتے اور اس کو ایک بڑی نیکی خیال کرتے تھے۔ قرآن نے اس رسم کو بے فائدہ قرار دیا اور بتایا کہ نیکی دراصل تقویٰ ہے:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۸۹)

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں پیچھے سے آؤ، بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا، اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو۔“

ایام حج میں عرفات سے واپسی کے بعد حجاج منیٰ میں قیام کرتے ہیں۔ اس قیام کی مدت میں اختلاف ہوا تو فرمایا

گیا:

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ.

(البقرہ۲:۲۰۳)

''اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو، جو شخص دو دنوں میں اٹھ کھڑا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ رعایت ان کے لیے ہے جو تقویٰ کا لحاظ رکھتے ہوں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور جان لو کہ تم اس کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

مذکورہ بالا آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ اسلام عبادت کے اشکال و مراسم کی بجا آوری کا حکم تو دیتا ہے کہ ان کے بغیر عبادت کی ادائیگی ممکن نہیں ہے، لیکن وہ اس میں غلو کو پسند نہیں کرتا کہ یہ چیز عبادت گزار کو مقصود عبادت سے، جو دراصل نیکی اور تقویٰ ہے، غافل کر سکتی ہے۔ اگر مقصد عبادت حاصل نہ ہو تو مجرد عبادت کے ظاہری اعمال و رسوم کی ادائیگی سے کوئی فائدہ نہ تو اس دنیا میں حاصل ہو گا اور نہ ہی آخرت میں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی واضح کیا کہ ظواہر عبادت میں غلو کوئی پسندیدہ چیز نہیں، بلکہ منافی عبادت ہے۔ عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جمرہ کے پاس اس حال میں دیکھا کہ لوگ آپ سے مسائل پوچھتے جاتے تھے۔ ایک شخص نے کہا، یا رسول اللہ میں نے رمی کرنے سے پہلے قربانی کر لی۔ آپ نے فرمایا، اب رمی کر لو، اس میں کچھ حرج نہیں (رم و لا حرج فيه) دوسرے نے کہا، یا رسول اللہ میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوا لیا۔ آپ نے فرمایا، اب قربانی کر لو، اس میں کچھ حرج نہیں (انحر و لا حرج) پس آپ سے جس چیز کی بابت پوچھا گیا، خواہ وہ مقدم کی گئی ہو یا موخر، تو آپ نے یہی فرمایا کہ اب کر لو کوئی حرج نہیں۔ (افعل و لا حرج فيه[۵۷])

مناسک حج میں تقدیم و تاخیر سے متعلق ایک دوسری روایت ملاحظہ ہو:

عن اسامة بن شريك، قال خرجت مع رسول اللّٰه حاجا فكان الناس ياتون، فمن قال يا رسول اللّٰه سعيت قبل ان

''اسامہ بن شریک کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے نکلا۔ پس لوگ آپ کے پاس آتے، کوئی کہتا یا رسول اللہ میں نے طواف سے پہلے

۵۷؎ بخاری و مسلم، مزید دیکھیں، کتاب العلم لابن عبدالبر، ۱/ ۲۴۔ (رقم ۱۲۷)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اطوف او اخرت شيئا، فكان يقول لا حرج الا على رجل افترض عرض مسلم وهو ظالم فذالك الذى حرج وهلك[58].

سعی کر لی، کوئی کہتا، میں نے فلاں چیز پہلے کر لی اور فلاں چیز بعد میں کی۔ آپ ان کو جواب دیتے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج کی بات اور ہلاک کرنے والی بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر حملہ کرے۔''

معلوم ہوا کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں پر جو عبادات فرض کی ہیں ان میں اصل اہمیت اعمال و رسوم کو نہیں، بلکہ اس کی روح یعنی تقویٰ کو حاصل ہے۔

عبادات کی غایت

اسلام میں جو چار عبادتیں (نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج) فرض ہیں ان کا مقصود، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، تقویٰ ہے یعنی دل کی کامل رضامندی سے اللہ کی فرماں برداری۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کی اطاعت و بندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود آدمی کا نفس اور اس کی متلون خواہشات ہیں۔ یہ خواہشات بڑی سرکش اور منہ زور واقع ہوئی ہیں۔ اگر آدمی ہمہ وقت بیدار اور ہشیار نہ ہو اور ان بے عناں خواہشات کو مغلوب کر کے نہ رکھے تو یہ نہایت آسانی کے ساتھ قلب و دماغ پر اپنا غلبہ و تسلط جما لیتی ہیں۔ اس غلبہ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خود اس کا نفس ہی اس کا معبود بن جاتا ہے اور وہ خواہشات نفسانی کی پیروی میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ. (الجاثیۃ ۴۵: ۲۳)

''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفس کو ہی اپنا معبود بنا لیا ہے۔''

اسلامی عبادات کی سب سے بڑی غرض یہی ہے کہ مومن ہوائے نفس پر قابو یافتہ ہو اور خواہشات کی اطاعت و غلامی کے بجائے خدائے واحد کی دل سے فرماں برداری کرے اور کسی حال میں اس کے حکم سے روگردانی نہ کرے، دوسرے لفظوں میں تقویٰ کی زندگی گزارے۔ مختلف عبادات کے ذکر میں اس حقیقت کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً نماز کے ذکر میں ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ

''پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کے جاں نشین ہوئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشات نفس

---

[58] مشکوٰۃ، کتاب المناسک۔

یَلْقَوْنَ غَیًّا. (مریم ۱۹:۵۹)

کی پیروی کی۔ یہ لوگ عنقریب اپنی گم راہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ترک نماز کا لازمی نتیجہ اتباع شہوات ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قیام نماز کا ایک بڑا مقصد نفس کے غلبہ کو توڑنا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الصَّلَاۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ. (عنکبوت ۲۹:۴۵)

''بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

زکوٰۃ کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے:

وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی. (الّیل ۹۲:۱۸)

''اس (نارجہنم) سے اس خدا ترس کو محفوظ رکھا جائے گا جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ وہ پاک ہو جائے۔''

اوپر کی آیت میں جس پاکیزگی کا ذکر ہے اس سے مراد بخل اور حرص مال کی گندگی سے نفس کا پاک ہونا ہے:

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (التغابن ۶۴:۱۶)

''اور جو شخص حرص نفس کی آلودگی سے محفوظ رکھا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

روزہ کے بیان میں ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲:۱۸۳)

''اے ایمان والو، تم پر اسی طرح روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر وہ فرض تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

حج کے ذکر میں ہے:

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ. (الحج ۲۲:۳۷)

''اور اللہ کو نہ جانوروں کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، اس کے پاس جو چیز پہنچتی ہے وہ صرف تمھارا تقویٰ ہے۔''

مشرکین عرب کے یہاں یہ دستور تھا، اور یہود میں بھی یہ رسم مروج تھی کہ وہ جانوروں کی قربانی کر کے اس کا خون عبادت گاہ پر چھڑکتے اور اس کے گوشت کو مذبح پر جلا کر اس کی خوش بو کو خدا تک پہنچاتے اور یہ گمان کرتے کہ خدا اس عمل سے خوش ہوتا ہے اور ان کے گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ قربانی کا مقصد ان ظاہری اعمال و رسوم کی انجام دہی نہیں، بلکہ اس کا اصل مقصد تقویٰ ہے، یعنی اللہ نے جانوروں کی شکل میں جو نعمت ان کو بخشی ہے اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پر اس کا شکر بجا لائیں اور اس کے نام پر ان کو ذبح کریں تاکہ دلوں سے مال کی محبت نکلے اور فاقہ کشوں کی بھوک مٹانے کا سامان ہو۔

اسلام کے تصور عبادت کی اس تفصیل وتوضیح سے قارئین کو معلوم ہو گیا کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اس کا تصور عبادت زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ ایک موحدانہ تصور عبات ہے جس میں شرک کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس میں عبادت کے اشکال و مراسم کے بجائے اس کی روح وکنہ (تقویٰ) کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں عبادت کے راہبانہ تصور کی مکمل طور پر نفی کی گئی ہے اور دین و دنیا کی تفریق کے قدیم مذہبی تصور کو ختم کر کے ہر اس کام کو، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، عبادت قرار دیا گیا جو خدا کے حکم کے مطابق اس کی رضا کے لیے کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد، دونوں پر عبادت کا اطلاق کیا گیا اور ان کو مناسب اہمیت دی گئی ہے۔

لیکن اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا ہو گا کہ اسلام کا یہ وسیع تصور عبادت اب خود مسلم معاشرہ میں ایک اجنبی چیز بن چکا ہے۔ مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کی پیروی میں عبادت کو رسمی پرستش اور اس کے چند ظاہری اعمال و رسوم کی انجام دہی تک محدود کر دیا ہے۔

معاملات زندگی میں خدا کی فرماں برداری اس کے دائرہ سے خارج ہے۔ غربا و مساکین کی خبر گیری سے، جسے اسلام میں عبادت کا درجہ حاصل ہے، اکثر مسلمان بالکل غافل ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات ان کا غیر موحدانہ رویہ ہے۔ بہت سے مسلمان نمازیں پڑھتے ہیں، مگر بزرگان دین کے مزارات پر جا کر وہاں سجدے بھی کرتے ہیں اور ان کو کارساز سمجھ کر حاجت روائی کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اس سے بڑی توہین عبادت اور کیا ہو گی۔ مختصر یہ کہ عبادت اب ایک رسمی عمل ہے اور اس کا مقصد صرف حصول ثواب ہے نہ کہ تقویٰ اور تزکیۂ نفس۔

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ

عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود بنو ہذیل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ اپنے جد ہذیل بن مدرکہ کے نام سے موسوم تھا اور قریش کی شاخ بنوزہرہ کا حلیف تھا۔ مدرکہ پر عبیداللہ کا شجرۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ مبارک سے جا ملتا ہے۔ خزیمہ بن مدرکہ آپ کے جد تھے۔ عبیداللہ کے دادا عتبہ بن مسعود جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود کے بھائی تھے، ان دونوں کو غزوۂ بدر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ عتبہ کے تیسرے بھائی عتبہ بن مسعود بھی صحابی رسول تھے، لیکن وہ جنگ بدر میں شریک نہ تھے۔ عتبہ بن مسعود کے بیٹے اور عبیداللہ کے والد عبداللہ نیک سیرت مسلمان تھے، خلیفۂ ثانی عمر بن خطاب نے انھیں عامل مقرر کیا اور ان کی ستایش کی۔ عون اور عبدالرحمان عبیداللہ کے بھائی تھے۔ عون بن عبداللہ فقیہ اور ادیب تھے، کچھ دیر مروان بن حکم کے ساتھ رہنے کے بعد ایک طویل عرصہ عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ گزارا۔ عبدالرحمان فقیہ تھے نہ ادیب، ان کا زیادہ ذکر نہیں ملتا۔ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔

عبیداللہ فقہاے سبعۂ مدینہ میں سے ایک تھے۔ فقہ وحدیث کے ان ماہرین کے نام یہ ہیں: قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، ابوبکر بن عبدالرحمان مخزومی، سعید بن مسیّب، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، خارجہ بن زید اور سلیمان بن یسار۔

عبیداللہ بن عبداللہ نے زفر بن اوس، زید بن خالد جہنی، سہل بن حنیف، شبل بن حامد مزنی، عبداللہ بن زمعہ، عبداللہ بن عتبہ (عبیداللہ کے والد)، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود (ان کے دادا کے بھائی)، عبدالرحمان بن عبدالقاری، عثمان بن حنیف، عروہ بن زبیر (ہم عصر فقیہ)، مسور بن مخرمہ، نعمان بن بشیر، ابوسعید

خدری، ابوطلحہ انصاری، ابوہریرہ، ابوواقد لیثی، سیدہ عائشہ، سیدہ میمونہ، فاطمہ بنت قیس اور ام قیس بنت محصن سے احادیث روایت کیں۔

اس فقیہ مدینہ سے حدیث روایت کرنے والوں میں شامل ہیں؛ خصیف بن عبدالرحمان، سالم ابوالنضر، سعد بن ابراہیم، سعید بن ابوہند، صالح بن کیسان، ضمرہ بن سعید، طلحہ بن یحییٰ، ابوزناد، عبداللہ بن عبیدہ، عبدالرحمان بن محمد، عبدالمجید بن سہیل، عراک بن مالک، عون بن عبداللہ (ان کے بھائی)، ابن شہاب زہری، موسیٰ بن ابوعائشہ، ابوبکر بن ابوجہم اور ابوزعراجشمی۔

ابن سعد نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کو تابعین مدینہ کے طبقۂ ثانیہ میں شامل کیا ہے۔ واقدی کہتے ہیں: ''عبیداللہ ثقہ عالم اور فقیہ تھے۔ کئی احادیث کے راوی ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے۔'' اہل رجال نے ان کے تقویٰ اور کردار کو سراہا ہے۔ عثمان بن سعید نے یحییٰ بن معین سے پوچھا، ''عبداللہ بن عباس کے بعد ان کو عکرمہ زیادہ پسند ہیں یا عبیداللہ بن عبداللہ؟'' ان کا جواب تھا، ''دونوں ایک جیسے ہیں۔'' انھوں نے ان میں کوئی فرق نہ کیا۔

زہری عبیداللہ بن عبداللہ کی خدمت میں رہے، انھیں پانی بھر کر دیتے حتیٰ کہ یہ اپنی باندی سے کوئی چیز مانگتے تو کہتی، ''اپنے غلام (زہری) سے (مانگیں)۔'' وہ کہتے ہیں، ''میں نے (علم کے) چار سمندروں کو دیکھا ہے، ان میں سے ایک عبیداللہ بن عبداللہ تھے۔ میں علم دین کا سماع کر چکا تھا، جب عبیداللہ سے میری ملاقات ہوئی تو یوں لگا جیسے میں گھاٹی میں پھنسا تھا اور وادی میں گر گیا ہوں، لگتا تھا میں نے کچھ علم نہیں سیکھا۔ میں نے بارہا چاہا، ایسے فقہی مسائل کا کھوج لگاؤں جو عبیداللہ بن عبداللہ ہی کے ہاں مل سکتے ہوں، مجھے ہمیشہ اس میں کامیابی ہوئی۔'' زہری بیان کرتے ہیں، ''ابوسلمہ عبداللہ بن عباس سے سوالات کرتے تھے تو وہ کھل کر جواب نہ دیتے۔ عبیداللہ بن عبداللہ نرمی اور ملائمت سے پوچھتے تو ان کی عزت افزائی کرتے۔''

عبدالعزیز زہیٰ کا کہنا ہے، ''میں کسی عالم کی صحبت میں بیٹھتا تو میرا یہی خیال ہوتا کہ میں اس کے پاس والا علم پہلے سے جانتا ہوں۔ عروہ بن زبیر کے ہاں جاتا رہا ان سے جو باتیں سنتا مکرر ہوتیں۔ عبیداللہ بن عبداللہ کا معاملہ دوسرا ہے، جب بھی ان کے پاس آتا ان کے ہاں نیا علم ملتا۔'' خلیفۂ خامس عمر بن عبدالعزیز ان کے شاگرد رہے۔ انھوں نے خلافت کا احیا کیا تو عبیداللہ وفات پا چکے تھے، اکثر کہا کرتے، ''کاش میری عبیداللہ بن عبداللہ سے دیت کے مسئلے پر ایک نشست ہو جاتی۔'' حمزہ بن عبداللہ کی روایت کے مطابق انھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں یہ بھی فرمایا: ''اگر عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ زندہ ہوتے تو انھی کی رائے سے فیصلے کرتا۔ میری بڑی خواہش ہے، مجھے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خون بہا اور تاوانوں کے مسائل پر گفتگو کے لیے عبید اللہ کا ایک دن مل جاتا۔'' یہ ان کا تجربہ تھا کیوں کہ عبید اللہ امارت حجاز کے دور میں ان کی مجلس مشاورت میں شریک رہ چکے تھے۔ اس مجلس میں مذکورہ فقہاے سبعہ کے علاوہ ابوبکر بن سلیمان، سالم بن عبداللہ اور عبداللہ بن عامر بن ربیعہ شامل تھے۔

عبید اللہ کا حافظہ خوب تیز تھا۔ خود فرماتے ہیں، ''میں نے جب بھی حدیث سن کر یاد کرنا چاہی تو یاد ہو جاتی۔'' ابوبکر بن عبدالرحمان مخزومی کی طرح عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ بھی نابینا تھے۔ مورخین صراحت نہیں کرتے کہ وہ پیدایشی نابینا تھے یا ان کی بینائی بیماری سے زائل ہوئی البتہ، الذاہب البصر اور الضریر کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاسم بن محمد کی طرح کسی عارضے سے ان کی نظر جاتی رہی ہوگی۔ آخری عمر میں اکثر علما و محدثین کی نظر خراب ہو جاتی تھی اس لیے کہ ان دنوں موتیا (Cataract) اور ناخنے (Corneal opacity) کا تسلی بخش علاج نہ ہوتا تھا۔ عبید اللہ کی مونچھیں پست ہوتیں نہ بہت بڑی۔

ابن عباس عبید اللہ کو پسند کرتے تھے اور ان کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے، ان کا حضرت عائشہ، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس سے بیک وقت تلمذ رکھنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ تمام فقہا صحابہ کی آرا اور فتاویٰ کو مدنظر رکھ کر فتویٰ دیتے تھے کیوں کہ صحابہ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد مدینہ کے فقہاے سبعہ ہی سے استفتا کیا جاتا تھا اور عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ انھی میں شامل تھے۔ پانچویں خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز کا دیت کے بارے میں عبید اللہ سے مشورے کی خواہش کرنا ظاہر کرتا ہے کہ عبید اللہ کو دیت و تاوان کے مسائل کی خصوصی مہارت حاصل تھی۔

عبید اللہ جذبات کے اظہار کے لیے اپنی شعری صلاحیت کا بھرپور استعمال کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ گورنر حجاز عمر بن عبدالعزیز سے ملاقات کو گئے، وہ حضرت عثمان کے پوتے عبداللہ بن عمرو سے بات چیت میں مصروف تھے، دربان نے انھیں لوٹا دیا۔ عبید اللہ کو غصہ آیا اور عمر بن عبدالعزیز کو خطاب کرتے ہوئے یہ اشعار کہہ ڈالے۔

کمثلك انی تابع صاحباً مثلی | ابن لی فکن مثلی او ابتغ صاحباً
من الناس الا مسلم کامل العقل وما | عزیز اخائی لا ینال مودتی
اذا لم یؤلف روح شکل الی شکل | یلبث الفتیان ان یتفرفوا

''مجھ سے جدا ہو کر میری طرح تنہا ہو جاؤ یا کوئی ساتھی ڈھونڈ لو میں بھی تمھاری طرح اپنے جیسے دوست کی پیروی کروں گا۔ مجھ سے بھائی چارہ دشوار ہے، کوئی انسان میری محبت نہیں پا سکتا ہاں پوری عقل رکھنے والا مسلمان (اس کے لیے یہ ممکن ہے)۔ تھوڑی ہی دیر لگتی ہے کہ جوان بکھر جاتے ہیں جب ایک صورت کا اندرون دوسری صورت کے اندرون سے جڑا نہ ہو۔''

عمر بن عبدالعزیز کو ان اشعار کا پتا چلا تو انھوں نے ابوبکر بن سلیمان اور عراک بن مالک کو ان کے پاس معذرت کرنے کے لیے بھیجا یوں بات رفع دفع ہوئی۔ ابوبکر بن محمد بن حزم، عراک بن مالک اور عبیداللہ بن عبداللہ طویل عرصہ مدینہ میں اکٹھے اٹھتے بیٹھتے رہے پھر ابن حزم مدینہ کے گورنر اور معاملات حج کے منتظم بن گئے جب کہ عراک قاضی ہو گئے۔ دونوں مدینہ آتے، عبیداللہ کے پاس سے ہو کر چلے جاتے، انھیں سلام کرنے آتے نہ ان سے ملتے۔ عبیداللہ نابینا ہو چکے تھے، انھیں خبر ہوئی تو یہ شعر کہے۔

الا ابلغا عنى عراك بن مالك و لا تدعا ان تثنيا بابى بكر فقد

جعلت تبدو شواكل منكما كانكما بى موقران من الصخر

وطاوعتما بى داعكا ذا معاكة لعمرى لقد ازرى وما مثله يزرى

و لو لا اتقائى ثم بقياى فيكما للمتكما لوما احر من الجمر

''سنو! میری طرف سے عراک بن مالک کو پہنچا دو اور تمھارا ابوبکر بن سلیمان کی طرف جانا رہ نہ جائے۔ تمھارے طور طریقے ظاہر کرنے لگے ہیں گویا تم مجھ پر چٹان سے بڑھ کر بوجھل ہو۔ تم دونوں نے میرے بارے میں ایک بے وقوف، احمق کی بات مانی۔ قسم میرے دین وایمان کی اس نے تہمت لگائی، (اس نے وہ عیب جوئی کی) جو اس جیسا ہی کر سکتا ہے۔ میں نے تم دونوں کو برا کہنے کی روش چھوڑی نہ ہوتی اور مجھے تم پر ترس نہ ہوتا تو تمھیں ضرور انگاروں سے زیادہ دہکتی گرم ملامت کرتا۔''

اخلاق حمیدہ پر کہے ہوئے اشعار میں سے ہے۔

اذا كان لى سر فحدثته العداء وضاق به صدرى فللناس اعذر

و سرك ما استودعته و كتمته و ليس بسر حين يفشو و يظهر

''جب میرا کوئی راز ہو اور میں دشمنوں کو اس کی خبر کر دوں پھر اس کے افشا کی تکلیف اٹھانے کی طاقت نہ رکھوں تو یہ دشمن لوگ تو معذور ہیں۔ تمھارا بھید وہی ہے جو تجھے سونپا جائے اور تو اسے چھپا کر رکھے۔ راز نہ رہا جب پھیل گیا اور مشہور ہو گیا۔''

عبیداللہ کے قبیلے ہذیل کی ایک حسین وجمیل عورت مدینے آئی، کئی لوگوں نے اسے شادی کا پیغام بھیجا۔ عبیداللہ نے بھی کچھ اشعار کہے اور باقی فقہاے سبعہ کو اپنی فریفتگی کا گواہ بنا ڈالا، سعید بن مسیّب کو پتا چلا تو کہا، ''عبیداللہ نے ہم سے پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی، انھیں معلوم تھا کہ اس عورت نے اگر ہماری گواہی مانگی تو ہم اسے ہرگز جھوٹی بات نہ بتائیں گے۔'' انھوں نے اپنی بیوی عثمہ کے بارے میں بھی کئی شعر کہے۔

عبداللہ بن ذکوان کہتے ہیں: ''عبیداللہ بن عبداللہ شعر کہتے تھے، جب ان پر اعتراض کیا جاتا تو جواب دیتے، ''تمھارا کیا خیال ہے، جس کے سینے میں جلن اور درد ہو، اگر نہ تھوکے مر نہیں جائے گا؟'' زہری نے اپنے استاد عبیداللہ سے کہا، اللہ آپ پر رحم فرمائے! کیا آپ اپنے فضائل اور اپنی عبادات کے بارے میں بھی شعر کہہ ڈالتے ہیں تو بھی انھوں نے یہی جواب دیا۔ بنو ہذیل کی عورت اور اپنی بیوی عثمہ کے بارے میں ان کے اشعار کو رکیک قرار دیا گیا تو معترضین کی یوں تشفی کی 'فی اللدود راحة المفؤد' بیماریٔ دل میں مبتلا شخص کو لڑ جھگڑ کر زبردستی منہ میں انڈیلی جانے والی دوا سے آرام آتا ہے۔

عبیداللہ صحابہ سے بہت محبت رکھتے تھے کیوں کہ دین حق اسلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انھی کے ذریعے سے مسلمانوں تک پہنچا تھا۔ ایک شخص عبیداللہ کے پاس آ کر بیٹھتا تھا۔ انھیں معلوم ہوا، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی کو برا کہتا ہے۔ اگلی بار وہ آیا تو عبیداللہ نے اس کی طرف التفات نہ کیا۔ اسے محسوس ہوا تو کہا، ''اگر آپ میرا کوئی قصور سمجھتے ہیں تو معاف فرمائیں۔'' عبیداللہ نے پوچھا، ''کیا تمھیں اللہ کے علم میں شک ہے؟'' جواب ملا، ''اعوذ باللّٰہ، ایسا ہو۔'' پھر سوال کیا، ''کیا تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر میں شبہ ہے؟'' اس شخص نے کہا، ''ایسا سمجھنے سے اللہ کی پناہ۔'' عبیداللہ نے کہا، ''فرمان الٰہی ہے، 'لقد رضی اللّٰہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرة' (اللہ اہل ایمان سے راضی ہو گیا جب وہ (کیکر کے) درخت کے نیچے تمھاری بیعت کر رہے تھے) (سورۂ فتح: ۱۸) تمھارا حال یہ ہے کہ تم فلاں صحابی (حضرت علی) کو برا کہتے ہو جب کہ وہ بیعت کرنے والوں میں شامل ہے۔ کیا تمھارے پاس اطلاع آئی ہے کہ اللہ اس سے راضی ہونے کے بعد ناراض ہو گیا ہے؟'' اس شخص نے کہا، ''بخدا، میں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔'' یہ شخص عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود کے شاگرد، خلافت راشدہ کا احیا کرنے والے عمر بن عبدالعزیز تھے، بنو امیہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے۔

عبیداللہ کے مرض الموت کے متعلق معلومات نہیں ملتیں۔ بخاری کہتے ہیں وہ علی بن حسین زین العابدین کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ۹۴ھ میں فوت ہوئے۔ ترمذی اور واقدی کے خیال میں ان کا سن وفات ۹۸ھ ہے۔ ابن سعد نے ۹۸ھ اور ۹۹ھ دو سن بتائے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے ۱۰۲ھ والی روایت کو ترجیح دی۔

مطالعۂ مزید: طبقات ابن سعد، تہذیب الکمال (مزی)، وفیات الاعیان (ابن خلکان)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلا (ذہبی)۔ الاغانی (ابوالفرج اصفہانی)

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ساجد حمید

بدگمانی کیا ہے، اس سے کیسے بچیں؟

۱

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بدگمانی عربی کے لفظ 'الظن' کا ترجمہ ہے۔ عربی کا 'ظن' اچھے اور برے دونوں معنی میں آتا ہے۔ جس طرح اردو میں گمان دونوں معنی میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بدگمانی سے روکا گیا ہے، وہاں 'سوء الظن' کے بجائے صرف 'ظن' ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ...	''اے ایمان والو، کثرت گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں...''
	(الحجرات ۴۹:۱۲)

اصل حکم

اوپر مذکور آیت سے یہ واضح ہے کہ قرآن مجید نے محض بدگمانی سے نہیں روکا، بلکہ اس نے کثرت گمان سے روکا ہے۔ یعنی قرآن مجید نے ہمیں اس بات سے روکا ہے کہ ہم خواہ مخواہ دوسروں کے بارے میں ظنون تراشتے رہیں۔ یہاں سیاق کلام سے یہ بات بالکل متعین ہے کہ یہاں جن گمانوں کی بات ہو رہی ہے، وہ لوگوں ہی سے متعلق

ہیں۔یعنی اخلاقی دائرے میں آنے والے گمان۔انھی کی کثرت بری چیز ہے۔چونکہ یہ اخلاقیات سے متعلق ہے۔ اس لیے اخلاقیات میں ہر خرابی اسلام کے نزدیک برائی ہے،اوروہ ایک قابل مواخذہ جرم ہے۔

گویا لوگوں کے بارے میں ہمیں اصل میں ان ہی کے عمل ونظریہ کی بنیاد پر رائے بنانی چاہیے۔ان کے بارے میں ہماری رائے نہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہونی چاہیے اور نہ ہمارے بے بنیاد خیالات پر، جو بلا دلیل ہمارے دل میں پیدا ہو گئے ہوں۔ ہمارے وہ خیالات جن کی بنیاد محض ہمارا گمان ہو، درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تابیرنخل میں اپنی ایک رائے کے بارے میں فرمایا تھا:

فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُم، وَإِنَّ الظَّنَ يُخْطِئُ وَ يُصِيْبُ. (ابن ماجہ، رقم ۲۵۶۴)

''بھئی میں بھی تمھارے جیسا انسان ہوں، وہ میرا ایک خیال (گمان) تھا، اور خیالات صحیح بھی ہو جاتے ہیں اور غلط بھی۔''

گمانوں کی کثرت سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں خطا کا امکان ہے۔اگر ہمارا گمان صحیح بھی ہے تب بھی اس میں یہ خرابی ضرور موجود ہے کہ وہ ہمارا گمان ہے، کسی ٹھوس شاہد و دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ بندۂ مومن کو اپنی آرا کو حتی الامکان ٹھوس چیزوں پر مبنی کرنا چاہیے۔قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا . (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۶)

''اور جس چیز کا تمھیں علم نہیں، اس کے درپے نہ ہو کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز سے پرسش ہونی ہے۔''

قرآن کی رو سے اس ضمن میں اصلاً مطلوب یہی ہے کہ ہم لوگوں کے بارے میں کسی قسم کی ایسی آرا نہ بنائیں، جن کی ہمارے پاس ٹھوس بنیاد (علم) موجود نہ ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

گمانوں پر مواخذہ

قرآن مجید نے گمانوں کو قابل مواخذہ قرار دیا ہے۔گمان کئی پہلووں سے قابل مواخذہ ہو سکتے ہیں۔ہم ذیل میں چند اہم چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے، جو ہمارے گمانوں کی وجہ سے انجانے میں ہم سے سرزد ہو جاتی ہیں، اور یہی وہ چیزیں ہیں جو گمان کو گناہ بنا دیتی ہیں:

بے بنیاد خیال

بنی اسرائیل کی مذکورہ بالا آیت میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ایسی آرا بنانے پر ہماری پرسش ہوگی، جن کے پیچھے کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہوگی، بلکہ وہ محض ہمارے خیال اور گمان پر مبنی ہوگی۔قرآن مجید نے فرمایا ہے کہ ہماری پرسش آنکھ، کان اور دلوں سے بھی ہوگی (۱۷: ۳۶)۔جس آنکھ نے غلط دیکھا، اور جس کان نے غلط سنا، اور جس دل نے غلط سوچا وہ مجرم ہے وہ پکڑا جائے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ غلط اور بے بنیاد آرا پر ہماری پکڑ ہوگی۔اس لیے کہ بغیر کسی دلیل کے کسی کے بارے میں برا سوچنا ایک غلطی ہے۔اس لیے اس غلطی پر بھی باز پرس ہوگی۔

چونکہ ہمارے گمان بے بنیاد ہوتے ہیں، اس لیے ہم یہ نہیں جان سکتے کہ کون سا گمان گناہ والا ہے اور کون سا نہیں۔یعنی جب ہمیں حقیقت کا علم ہوگا تو تبھی پتا چلے گا کہ ہم غلط سوچ رہے تھے یا ٹھیک۔اس لیے حقیقت کے سامنے آنے تک ہم یہ نہیں جان سکتے کہ ہم غلط سوچ رہے ہیں یا صحیح۔اسی لیے قرآن مجید نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ بدگمانی کو ترک کرو، بلکہ اس نے کہا کہ بہت گمان نہ کیا کرو۔اس لیے کہ ان میں سے اکثر غلط ہی ہوں گے۔

بعض شارحین نے یہ بات کہی ہے کہ جو گمان اتہام اور بہتان کی شکل اختیار کر جائے وہ گمان گناہ ہے۔لیکن قرآن نے یہ بات نہیں کہی۔قرآن نے تو گمانوں میں سے بہت سے گمانوں کو گناہ قرار دیا ہے۔محض اس لیے کہ وہ بلا دلیل بنائے گئے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ناانصافی

گمانوں کے مواخذہ کی بڑی وجہ ان کے ہمارے رویوں پر اثرات ہیں۔اسی طرح گمانوں کی وجہ سے ہم ایسے عمل کر ڈالتے ہیں جو برے ہوتے ہے۔ان اعمال میں سب سے بڑا عمل ناانصافی ہے۔قرآن مجید کا وہ حکم جو سورۂ بنی اسرائیل میں آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گمان اور خیالات ہمارے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔شیطانی وسوسے اور ادھر ادھر کے خیالات دل میں آتے رہتے ہیں۔اگر ہم انھی خیالات پر جم گئے اور گمانوں پر ہی اپنے کسی بھائی کے بارے میں بری رائے بنالی تو وہ گناہ کا باعث ہے۔لیکن اگر وہ گمان ہمارے دل میں آیا، اور ہم اس میں مبتلا ہونے کے بجائے اس سے نکل گئے اور اس کو رد کر دیا تو ہم گناہ سے بچ گئے۔اس لیے کہ کسی کے بارے میں بری یا محض غلط رائے بنالینا اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔مثلاً آپ نیک نیتی سے کوئی عمل کریں، تو اس پر کوئی آدمی دل ہی دل میں یہ رائے بنالے کہ آپ ریا کار ہیں تو کیا یہ آپ کے ساتھ انصاف ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ انصاف نہیں

ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے یہ گمان گناہ بن جاتے ہیں۔

تعلقات پر برے اثرات

گمانوں سے ہونے والا دوسرا بڑا عمل ہمارے تعلقات میں خرابی ہے۔ ہمارے تعلقات میں اہم چیز ہماری رائے ہوتی ہے۔یعنی اگر کسی کے بارے میں ہماری رائے اچھی ہوگی تو ہم اس کو اچھے طریقے سے ملیں گے اور اگر ہماری رائے اس کے بارے میں اچھی نہیں ہوگی۔تو ہم اچھے طریقے سے نہیں مل سکیں گے۔اس طرح سے ہمارے گمان ہمارے رویوں کو خراب کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے گمان ہی کی بنا پر دوسرے سے معاملات کرنے لگ جاتے ہیں۔جس سے وہ گناہ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

یعنی اگر ایک آدمی نے برائی نہیں کی ،مگر ہم نے گمان ہی گمان میں اس کو مجرم بنالیا ہے تو اب اس کے ساتھ ہمارا رویہ بگڑ جائے گا، جو بلاوجہ ہوگا۔ برے رویے کی بنا پر ہم گناہ مول لے لیتے ہیں۔اس پہلو سے دیکھیں تو محض گمان بھی دراصل ان گناہوں میں سے ایک ہے، جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ تمھیں شعور بھی نہیں ہوتا، مگر وہ تمھارے اعمال کو ہڑپ کر جاتے ہیں (الحجرات ۴۹: ۲)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نیتوں کا تعین

گمان بالعموم نیت کا تعین بن جاتے ہیں۔ ہمارے تمام گمان جن کو ہم بدگمانی کہہ سکتے ہیں، ان کی نوعیت بالعموم یہی ہوتی ہے کہ ہم اپنے بھائی کی نیت کا تعین کرنے لگ جاتے ہیں کہ اس نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ مجھے تنگ کرنا چاہتا تھا، وہ سب کے سامنے مجھے ذلیل کرنا چاہتا تھا وغیرہ۔

نیتوں کے بارے میں ہم جان ہی نہیں سکتے۔اس لیے اس کا تعین ایک غلطی ہے۔ جو غلطی اخلاقی دائرے میں ہوتی ہے، وہ گناہ ہے۔اس پر قیامت کے دن مواخذہ ہوگا۔

اس کی بہت عمدہ مثال وہ واقعہ ہے جو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو پیش آیا جب انھوں نے ایک جنگ میں کسی آدمی کو کلمہ پڑھنے کے باوجود مار ڈالا تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ چنانچہ جب ان سے بات ہوئی تو آپ نے فرمایا: 'أقال لا اله الا اللّٰه و قتلته'، ''کیا اس نے لا الٰہ پڑھا اور پھر بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا''؟

حضرت اسامہ نے عرض کی: 'یا رسول اللّٰه انما قالها خوفا من السلاح'، ''اس نے ایسا صرف اسلحہ

کے ڈر سے کہا تھا۔‘‘

آپ نے فرمایا: ’افلا شققت عن قلبه حتی تعلم اقالها ام لا ‘، ’’تم نے اس کا سینہ چیر لیا ہوتا کہ تم جان لیتے کہ اس نے کلمۂ اسلام دل سے کہا یا نہیں!‘‘

حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ آپ بار بار یہ جملہ دہراتے رہے، اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا اور یہ غلطی مجھ سے صادر نہ ہوئی ہوتی۔ (مسلم، رقم ۹۶)

یہ حضرت اسامہ کا ایک گمان تھا، نا معلوم صحیح تھا یا غلط؟ لیکن انھوں نے اس کی غلط نیت طے کی اور اس کے خلاف جان لینے تک کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ نیت کا تعین بھی ایک برائی ہے۔ جو ہمیں بہت سنگین عمل تک لے جا سکتی ہے۔

گمان جھوٹ ہوتا ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گمانوں سے بچو اس لیے کہ گمان ’اکذب الحدیث‘ ہوتے ہیں۔ یعنی بے بنیاد اور جھوٹی بات۔ اس سے بھی اس کے ’اثم‘ ہونے کی طرف اشارہ نکلتا ہے، یعنی چونکہ یہ جھوٹی بات ہے، جو انسان دل ہی دل میں سوچ لیتا ہے۔ اور یہ واضح سی بات ہے کہ جھوٹی بات پر قیام بندۂ مومن کے لیے صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ گناہ اور برائی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

غلطی میں اضافہ

ہم اپنے گمانوں کی مدد سے کبھی تو بے گناہ کو گناہ گار بنا رہے ہوتے ہیں، اور کبھی کم خطا وار کو زیادہ بڑی غلطی کا مجرم ٹھہرا رہے ہوتے ہیں۔ یعنی ایک آدمی سے غلطی محض بے احتیاطی کی وجہ سے ہوئی ہو، مگر ہم اسے یہ خیال کر کے کہ اس نے ہماری دشمنی میں ایسا کیا ہے۔ اس کے جرم کی سنگینی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

چنانچہ بعض اوقات اپنی ہی چیز اٹھانے والے کو ہم چور سمجھ لیتے ہیں۔ غلطی سے برائی کر جانے والے کو مجرم بنا ڈالتے ہیں۔

سچا گمان غیر ثابت شدہ حقیقت

کوئی شخص یہاں یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اگر آدمی گمان کرے، اور وہ غلط نہ ہو، تو وہ تو گناہ گار نہیں ہوگا۔ تو کیا یہ

ضروری ہے کہ کثرت گمان پر پھر بھی گناہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ گمان سچا بھی ہو تب بھی وہ گمان ہے۔ وہ کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔اس لیے اس پر قائم رہنا، یا اس کے مطابق عمل کرنا دراصل غیر ثابت شدہ باتوں پر عمل کرنا ہے۔اس میں اور سنی سنائی باتوں میں پھر فرق کیا رہ گیا؟

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو تو اس گمان کے سچا ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔آپ تو محض گمان پر کھڑے ہیں۔ جو ایک کمزور اور غلط جگہ ہے۔ایک گمان کے سچا اور جھوٹا ہونے کے برابر امکانات ہوتے ہیں۔اس لیے گمان کرنا اور اسے دل میں پالنا ہر صورت میں ایک غلط کام ہے۔

دوبارہ نظر

ہم نے اوپر کی بحث میں یہ بات جانی ہے کہ کثرت گمان سے قرآن مجید نے روکا ہے۔اس لیے کہ گمان ایک بے بنیاد اور جھوٹی بات ہے۔جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو وہ ثابت شدہ نہیں ہے۔

کسی کے بارے میں گمان کرنا اخلاق سے گرا ہوا عمل ہے۔ دین اسلام میں اخلاقی خرابی کو گناہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یعنی اس پر مواخذہ ہوگا۔'ظن' دراصل جھوٹ، ناانصافی اور نیتوں کے تعین وغیرہ کا نام ہے۔ یہ برے اخلاق کو جنم دیتا ہے۔اس اعتبار سے یہ ایک واضح برائی ہے۔

گمانوں کی کثرت بذات خود ناپسندیدہ چیز ہے۔اس لیے کہ بندۂ مومن گمانوں اور خیالات پر نہیں جیتا، بلکہ اس کی زندگی ٹھوس حقائق پر استوار ہونی چاہیے اور لوگوں کے بارے میں اسے سیدھی اور ثابت شدہ بات پر قائم ہونا چاہیے۔

حسن ظن کا حکم

ہم مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ اپنے بہن بھائیوں، ہم سایوں، دوستوں اور ارد گرد رہنے والوں کے بارے میں حسن ظن رکھیں۔سورۂ نور کی آیت افک سے ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ ہماری عمومی رائے دوسروں کے بارے میں اچھی ہونی چاہیے، جب تک کہ وہ ٹھوس دلائل سے بدل نہ جائے۔اچھی رائے سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب بھی کوئی برائی کسی آدمی سے متعلق آپ کے علم میں آئے تو فوراً:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔اس کو اچھے پہلو سے دیکھیں۔

۲۔اس کے اچھے اسباب اور وجوہ پر نظر رکھیں۔

۳۔جس پر الزام لگایا جارہا ہے، اس پر الزام لگانے سے گریز کریں اور کہیں کہ ہم نے ایسا کرتے اسے نہیں دیکھا، بخدا ہماری نظر میں پاک صاف ہے۔

حسن ظن کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اس کے بارے میں کوئی بہت اچھی رائے قائم کریں۔ بلکہ یہ ہیں کہ اس کے عمل کو بری نظر اور بری توجیہ کر کے نہ دیکھیں، اور نہ محض سن کر یا اپنے گمانوں کی وجہ سے اس پر برائی کا الزام لگائیں۔کسی کی برائی سن کر فوراً برأت کا اظہار کرنا چاہیے۔ چنانچہ جب سیدہ عائشہ پر الزام لگا تو قرآن مجید نے مسلمانوں کو یہ نصیحت کی کہ ان پر لازم تھا کہ وہ سیدہ عائشہ کی برأت اور پاک دامنی کا اعلان کرتے اس لیے کہ ان میں سے کسی نے بھی انھیں کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ چاہیے یہ تھا کہ سب یک زبان کہتے کہ حاشا وہ پاک دامن اور معصوم ہیں۔ہم نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔قرآن مجید میں یہ بات یوں آئی ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُ وْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، لَاتَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ، بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ، وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. لَوْ لَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا، وَّقَالُوا: هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ. (النور۲۴: ۱۱۔۱۲)

’’جو لوگ یہ اتہام گھڑ کر لائے، وہ تم ہی میں سے ہیں۔تم اس چیز کو اپنے لیے برا خیال نہ کرو، یہ تمھارے لیے اچھی ہے۔ان میں سے ہر ایک نے جو گناہ کمایا وہ اس کے حساب میں پڑا، اور جو اس فتنہ کا بڑا حصہ دار ہے، اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔اے مسلمانو، ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مومن عورتیں اور مرد ایک دوسرے کی بابت اچھا گمان کرتے، اور کہتے کہ یہ تو ایک سیدھا سیدھا بہتان ہے۔‘‘

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ تقاضا کیا گیا ہے کہ ایسی سنگین صورت میں بھی ہمارا کام یہی ہونا چاہیے کہ جب ایک پورا گروہ یہ کہہ رہا ہو کہ فلاں شخص نے ایسا کیا ہے تو ہم پر لازم ہے کہ جرم ثابت ہونے سے پہلے اپنے بھائی اور بہن کے بارے میں اچھا گمان رکھیں اور اسے ایک بہتان سمجھیں۔

یہاں اس واقعۂ افک کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں جب غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی پر بعض منافقین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت دھری۔ بظاہر سیدہ کے پیچھے رہ جانے کے باوصف ایک ایسا قرینہ پیدا ہو گیا تھا کہ تہمت میں سچ کا گمان ہوتا تھا۔لیکن ایسے قرائن بھی قرآن کے نزدیک بے معنی ہیں۔اس لیے کہ پیچھے رہ جانے کا ہرگز

مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یقیناً ایسا ہوا ہوگا جیسی ان پر تہمت لگائی جا رہی تھی۔

ہمارا باہمی رشتہ اور بدگمانی

اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے بھائی بھائی بن کر رہیں۔ اس کے لیے اس نے ہمارے تین رشتے بتائے ہیں:

ایک خدا کی مخلوق

ہمارا آپس میں پہلا رشتہ یہ ہے کہ ہم سب کو مختلف خداؤں نے نہیں، بلکہ ایک ہی خدا نے بنایا ہے۔ ہم اس اعتبار سے خدا شریک بھائی ہیں۔ اس نظریہ سے ہمارے رشتے میں برابری کا ایک تصور آتا ہے۔ اگر مجھے کسی اور خدا نے بنایا ہو اور آپ کو کسی اور نے تو ہو سکتا ہے میرے اور آپ میں تفاوت ہو۔ اگر میرا خدا کمزور ہو اور آپ کا قوی تو میں آپ کے مقابلے میں حقیر ٹھہروں گا۔ لیکن اگر میرا اور آپ کا خدا ایک ہے۔ تو مجھ میں اور آپ میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۔ اس تفاوت کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ میرا اور آپ کا منبع و ماخذ ایک ہے۔ جس جگہ سے آپ آئے ہیں میں بھی وہیں سے آیا ہوں۔ جس خدا نے آپ کو بنایا ہے اسی نے مجھ کو۔ آپ کو مجھ پر اور مجھے آپ پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

۲۔ میری اور آپ کی فطرت ایک ہی خدا نے بنائی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری سرشت میں تو برائی رکھ دی گئی ہو، اور آپ کی سرشت میں نیکی۔ میرے اندر بھی ضمیر اور نفس کی کش مکش لگی ہے اور آپ کے اندر بھی۔ اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ہمیشہ برائی پر آمادہ رہوں اور آپ ہمیشہ نیکی پر۔ جس طرح آپ کی نیت صحیح ہوتی ہے، اسی طرح میری بھی صحیح ہوتی ہے۔ جس طرح آپ کبھی نفس کا شکار ہو جاتے ہیں اسی طرح میں بھی ہو جاتا ہوں۔ یہ سب ہمارے خدا نے اس لیے بنایا ہے کہ وہ ہمیں آزمائے۔

۳۔ میری اور آپ کی عزت یکساں ہے۔ میں جس جل جلالہ کی تخلیق ہوں آپ بھی اسی کی تخلیق ہیں۔ فلاں اور فلاں کو بھی اسی نے بنایا ہے۔ جو آپ کا مقام ہے، وہی میرا ہے وہی سب کا ہے۔ کسی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۴۔ اس تفاوت کے نہ ہونے کے معنی یہ بھی ہیں کہ میرا اور آپ کا خدا ایک ہے۔ وہی میرا نگہبان اور آپ کا بھی۔

میں بھی اسی کے سامنے جواب دہ ہوں اور آپ بھی۔ اگر آپ مجھ پر ظلم کریں گے تو وہ چونکہ میرا بھی رب ہے اس لیے وہ میرے اوپر ہونے والے ظلم کے تدارک کے لیے آپ کو پوچھے گا۔ اگر میں نے آپ پر ظلم کیا تو وہ آپ کی دادرسی کے لیے مجھ سے پوچھے گا۔ کسی کا یارا نہیں ہے کہ وہاں وہ خدا کی مخلوق پر ظلم کرے، اور کوئی دوسرا (خدا) آ کر چھڑا لے جائے۔ یہ تبھی ممکن ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا اتنا ہی طاقت ور خدا موجود ہو۔

ایک ماں باپ کی اولاد

دوسرا رشتہ قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں بسنے والے سب لوگ آدم وحوا کی اولاد ہیں، اور ان دونوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے نفس واحدہ سے پیدا کیا ہے۔ اس اعتبار سے ہم ایک ہی نفس واحدہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ ہم آپس میں نسبی اور رحمی تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ اب یہ تعلق دور کا تعلق ہے، لیکن ہماری رگوں میں اب بھی آدم وحوا ہی کا خون دوڑتا ہے:

يٰٓـاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّـنْ نَّـفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً.

''اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک ہی جان سے، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور پھر ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں۔'' (النساء ۴: ۱)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس تعلق سے کچھ نتائج نکلتے ہیں:

ایک یہ کہ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، اس لیے نسلی اعتبار سے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ذاتیں، قبائل اور اقوام محض پہچان اور تعارف کی چیز ہے۔ ان میں بہتر اور کہتر ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔

ملت واحدہ

اسلام میں داخل ہونے والوں کا باہم ایک رشتہ اور بڑھ جاتا ہے، وہ یہ کہ ہم سب دینی لحاظ سے بھی بھائی بھائی ہیں۔ 'ان المومنون اخوۃ' (سب مسلمان بھائی بھائی ہیں) کی تعلیم اسی تعلق کی طرف اشارہ ہے۔

نتیجہ

یہ تینوں تعلق ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ ہم باہم خلوص ومحبت، عزت واحترام، ہم دردی ومرحمت، شفقت و عنایت، مدد ونصرت اور باہمی اصلاح وخیر خواہی کے تعلق کے ساتھ برکتوں والا گھر بسا کر اور ایک خیر وامن والا معاشرہ بنا کر رہیں۔ قرآن مجید نے ہمیں اس پہلو سے بہت سی تعلیمات دی ہیں۔ اسی تعلق سے امت مسلمہ میں اتحاد و یگانگت پیدا ہوتی ہے، اسی سے یک جہتی اور اپنائیت وجود میں آتی ہے۔ اسی سے فرقے مکاتب فکر میں تبدیل ہو کر محض علمی اختلاف تک محدود ہو جاتے ہیں۔ اسی صورت میں حدیث کے مطابق اختلاف اللہ کی رحمت بنتا ہے۔

اس ہمہ جہت محبت و یگانگت کے اس تعلق کو قرآن فروغ دینا چاہتا ہے، تاکہ مسلمانوں کا معاشرہ ایک تعلق و ارتباط اور محبت ومرحمت کی بنا پر وجود پزیر ہو۔ اور وہ چاہتا ہے کہ مسلمان ان چیزوں سے بچے رہیں، جو اس تعلق کو توڑتی اور باہم تفریق پیدا کرتی ہیں۔ ایسی چیزوں کا قرآن مجید نے سورۂ الحجرات میں بالخصوص ذکر کیا ہے۔ جس میں مذاق اڑانا، چغلی وغیبت کرنا، تجسس کرنا، برے نام رکھنا، الزام تراشنا، ذات پات کی تفریق کرنا جیسے اخلاق رذیلہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھی میں ایک چیز گمانوں کی کثرت کا حکم ہے۔ یہ سب چیزیں ہمارے اندر تفریق اور جدائی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ہمیں ایک دوسرے سے کاٹتی ہیں۔ دلوں میں کدورتیں اور نفرتیں پیدا کرتی ہیں۔ جس معاشرے میں یہ چیزیں عام ہو جائیں وہاں سے بھائی چارہ، اخوت ومحبت اور بالآخر قومی وملی یک جہتی دم توڑ جاتی ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ گمانوں کی کثرت سے نقصانات کیوں کر وجود میں آتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

گمان کے نقصانات

جب ہمیں کسی کے کسی قول وفعل کی حقیقت جانے بغیر اپنے گمانوں کی بنا پر کچھ بے بنیاد خیالات بناتے ہیں، تو ہم اصل میں اپنی رائے اس کے بارے میں تبدیل کرتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہم اپنی رائے کو اس کے بارے میں خراب کر لیتے ہیں۔ جس سے کچھ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جن میں سے چند اہم چیزوں کا ہم ذیل میں ذکر کریں گے۔

دل میں میل آنا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس آ کر دوسروں کی برائی کرنے والوں کو یہ کہہ کر برائی کرنے سے منع کر دیا

کہ:

لا یبلغنی احد من اصحابی عن احد شیئا فانی احب ان اخرج الیکم وانا سلیم الصدر. (ابوداؤد، رقم ۴۸۶۲)

''مجھے میرے ساتھیوں میں سے کوئی کسی کے بارے میں کوئی بات نہ پہنچائے اس لیے کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ جب میں تم لوگوں میں آؤں تو میرا دل تم لوگوں کے بارے میں صاف ہو۔''

دوسروں کی برائی سے جس طرح دل میں میل آتا ہے، اسی طرح اپنے خیالات سے بھی دل میں میل آتا ہے۔ اس میل کے آنے سے ہمارے رویوں میں تبدیلی آتی ہے۔ کسی خیال سے دل میں غصہ پیدا ہوگا، کسی سے نفرت، کسی سے بے جا اور غیر متوازن محبت۔ یہ سب چیزیں خرابی پیدا کرتی ہیں۔ اچھے رویے کے اظہار کے لیے سب سے پہلی چیز ہی یہ ہے کہ ہمارا دل دوسروں کے بارے میں صاف ہو، ہم اسی صورت میں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرسکیں گے۔ گمانوں کا یہ نتیجہ بھی جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، گمانوں کو قابل مواخذہ بنا دیتا ہے۔ گمانوں سے آنے والا میل دل میں کدورتوں کو وجود بخشتا ہے، جس سے درج ذیل تعلقات میں تعطل اور خرابی آتی ہے:

۱۔ محبت

ایک دوسرے کے بارے میں گمانوں کی کثرت سے دل دوسروں کے بارے میں صاف نہیں رہتے، جس سے باہم فاصلے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے باہمی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ باہمی تعلق اتنا کمزور پڑ جاتا ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونا تو درکنار ان کے ساتھ محض وہ تعلق بھی نہیں رہتا جو ایک اجنبی انسان کا دوسرے اجنبی انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔

دل میں دوسروں کے بارے میں خرابی تعلقات کے کاٹنے کے لیے ایک کلہاڑا ہے۔ اگر آپ کسی کے بارے میں رائے بگاڑتے چلے جائیں تو یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کے دل میں اس کی محبت باقی رہے۔ اگر آپ دل کی صفائی کا اہتمام نہیں کرتے، تو یاد رکھیے کہ ماں باپ جیسے عزیز اور بیوی بچوں جیسے قریبی تعلق میں بھی دراڑیں آجاتی ہیں اور بسا اوقات نوبت قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے۔ محبت کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے خیالات کو دوسروں کے بارے میں بینات اور واضح حقائق پر استوار کریں۔

میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے کہ بعض ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی کہ جو محض خدا کے بارے میں اپنے خیالات ہی کی وجہ سے اللہ سے نالاں اور اس کے منکر تھے۔ ایسے ہی لوگوں سے ملاقات کے بعد میں نے ''ہم پر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مشکلیں کیوں آتی ہیں''نامی کتاب لکھی۔تاکہ ایسے بہت سے لوگوں کے دل میں خدا کے بارے خلجان دور ہو۔اس لیے کہ یہ چیز خدا کے ساتھ محبت کو برباد کرنے والی ہے۔اور خدا کے بارے میں محبت اور اپنائیت سے محرومی کفر و زندیقی اور الحاد تک پہنچ جاتی ہے۔

میری مراد یہ ہے کہ محبت کا یہ تعلق انسانوں کے ساتھ تو گمانوں کی وجہ سے ٹوٹتا ہی ہے، خدا کے ساتھ ہمارا تعلق بھی برے گمانوں سے ختم ہوجاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے حسن ظن کی نصیحت کیا کرتے تھے۔

۲۔بھائی چارہ

یہ انسان کا انسان سے وہ رشتہ ہے جو اولاد آدم ہونے کی بنا پر وجود میں آتا ہے اگر ہم محبت سے محروم ہو چکے ہوں تو ہمارا یہ رشتہ رفتہ رفتہ ختم ہوجائے گا۔ہم ایک دوسرے کے کام نہ آسکیں گے۔ ہماری باہمی کدورتیں اور باہمی عناد ہمیں دوسروں کی مدد کرنے، ان کے کام آنے، ان کی غم وخوشی میں پوری طرح شریک ہونے سے روکے گا۔ہم ایک ہی محلے اور معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں، مگر تعلقات میں محبت نہ ہونے اور دلوں میں فاصلوں کی وجہ سے کسی کے نہایت مشکل اور نازک موقعے پر بھی اس کے پاس سے بے پروائی سے گزر جاتے ہیں۔اس لیے کہ ہم گمانوں کی وجہ سے اس مجبور اور بے کس کے خلاف اپنی رائے خراب کر چکے ہوتے ہیں۔

۳۔مرحمت (ہم دردی)

باہمی محبت کی یہ کمی ہمارے اندر سے ہم دردی کا عنصر بھی ختم کر دیتی ہے۔ ہمارے جیسا انسان ہی بھوکا ہوتا، مرض سے کراہ رہا ہوتا ہے، مگر ہمارے دل میں کوئی خیال تک نہیں رینگتا کہ ہم اس کے کام آئیں، اس کی مدد کریں۔ یہ محض اسی موقع پر ہوگا جب ہماری اس کے بارے میں رائے خراب ہوگی۔ دوسروں سے ہم دردی نہ صرف ہمارا اخلاقی وجود تقاضا کرتا ہے، بلکہ ہمارا دینی وجود بھی اس کا تقاضا کرتا ہے۔قرآن مجید کے مطابق یہ ہمارا دوسروں پر اور دوسروں کا ہم پر حق ہے:

أَلَمْ نَجْعَلْ لَّهُ عَيْنَيْنِ. وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ. وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ . فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ. وَمَآ أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ: فَكُّ رَقَبَةٍ. أَوْاِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ. يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ . أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ. ثُمَّ كَانَ	''ہم نے کیا اس کو دو آنکھیں نہیں دیں (کہ محتاجوں کو دیکھتا)، اور زبان اور ہونٹ نہیں دیے (کہ ان کی مدد کی ترغیب دیتا)، اور دونوں راستے نہیں سجھائے (کہ اچھے برے کو سمجھتا؟ پر اس نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا) اور وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا، اور تم کیا سمجھے

مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ. (البلد ۹۰: ۸۔۱۷)

کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ (یہی کہ) گردن چھڑائی جائے، اور بھوک کے دن کسی قریبی یتیم یا کسی بے حال مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ پھر آدمی ان میں سے ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو ثابت قدمی کی اور دوسروں سے ہم دردی کی نصیحت کی۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔غریبوں، ناداروں اور رشتہ دار ضرورت مندوں کے کام آنا، ان پر اپنے مال میں سے خرچ کرنا کتنا ضروری ہے۔مگر بہت ساری وجوہات ہمیں اس سے روک دیتی ہیں۔ان وجوہات میں سے ایک بدگمانی بھی ہے جو ہمیں اس سے روکے رکھتی ہے۔

۴۔اجتماعی یا قومی وملی وجود

اوپر کے تینوں پہلو، معاشرے میں ساتھ ساتھ رہنے والے لوگوں کے گھر کی سطح پر یا محض انسان ہونے کے تعلق کے لحاظ سے تھے۔اب ہم گھر سے باہر اجتماعی اور سماجی سطح پر اس کا جائزہ لیں گے کہ گمانوں کی ستم گریاں کیا ہیں۔

اگر ہماری تربیت گھر کے اندر گمانوں کی کثرت میں جینے کی ہوئی ہو اور ہم اسی کے عادی ہوں، تو یہی چیز ہماری معاشرت میں بھی نظر آئے گی۔دفتر، تنظیم، معاشرہ اور ریاست ہر سطح پر یہ چیز اپنے اثرات ڈالے گی۔کہیں کوئی اپنے سربراہ کے بارے میں برے خیالات بن رہا ہوگا اور کہیں کوئی اپنے ساتھی کے کسی رویے پر کڑھ رہا ہوگا، اور کہیں کوئی انتقامی کارروائی کا سوچ رہا ہوگا۔کوئی انھی خیالات سے ڈیپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوگا اور کسی کا موڈ بن رہا ہوگا۔کوئی بات بات پر گرم ہو جاتا ہوگا اور کوئی کھانے کو آتا ہوگا۔اس سب کچھ کی وجوہات میں ایک وجہ وہ آرا اور تجزیے ہیں جن کی بنیاد محض گمان ہوتے ہیں۔

جس قوم کے گھر اور دفتر میں یہ حالات ہوں، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ صحت مند طریقے کے ساتھ دنیا میں چل سکے۔وہ ہر قدم پر فساد کا شکار ہوگی۔اس کا اتحاد ہر وقت معرض خطر میں ہوگا۔اس کی سیاست، مذہب اور معاشرت میں اتفاق واتحاد کی ہزار کوششیں ناکام ہو جائیں گی۔اس لیے کہ اتحاد کے لیے سب سے پہلی چیز ایک دوسرے پر اعتماد اور ان کی غلطیوں کو محض غلطی مان کر ساتھ چلنا ہے۔

۵۔تکریم

عزت وتکریم کے معنی محض یہ نہیں ہیں کہ ہم بڑوں کی عزت کریں، بلکہ انسان کی تکریم یہ ہے کہ اس کے وجود کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تسلیم کیا جائے، اس کے انسان ہونے کے ناطے اس کی عزت کی جائے۔ سوءظن کی عادت اس تکریم آدمیت سے روکتی ہے۔ سوءظن خطا کار کو شیطان کا روپ دے دیتی ہے، جس سے غلطی کرنے والا ہماری نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر جاتا ہے۔ یہی عمل ہم اپنے سوءظن کی بنا پر دوسروں سے کر رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہمارے ساتھ۔

جس معاشرے کے افراد میں گمان کرنے کا وصف ہوگا، اس میں ایک دوسرے کی تکریم، احترام، عزت اور بالآخر لحاظ اور پاس خاطر جاتا رہے گا۔ چنانچہ کسی شخص کو اس کا جائز مقام نہ مل سکے گا۔ بہو بیٹیاں اور ساس اسی اژدھے کی ڈسی ہوئی ہیں۔ افسر و ماتحت اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ سب کی نگاہوں میں سب ذلیل ہیں۔ عزت صرف دکھاوے کی رہ گئی ہے۔

[باقی]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com